اخلاق محمد ﷺ

قرآن حکیم کے آئینے میں

﴿۳﴾

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

ہجرت محض عمل نہیں بلکہ اخلاقِ حسنہ کی ایک بنیاد

ہجرت محض ایک ''زمانی'' اور ''مکانی'' عمل نہیں ہے، بلکہ ہجرت کا عمل کئی ایسی اخلاقی صفات کے اُبھرنے کا محرک بنتا ہے جو کسی اور طریقے سے انسان کی ذات، شخصیت اور کردار کا حصہ نہیں بن سکتیں۔

اپنے مقصد، اپنے ایمان اور ایک مسلم معاشرے کے قیام کے لئے اپنے وطن کو چھوڑ دینا اللہ پر توکل اور اعتماد کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ توکل اور اعتماد علی اللہ کی اخلاقی صفت ہجرت کے عمل سے پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ہم ہجرت کو کتابِ اخلاقِ نبی ﷺ میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

اپنے وطن کو چھوڑ کر نئے دیار کا رُخ کرنا مستقبل کے سمندر میں اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے چھلانگ لگانے کے مترادف ہے۔ ماں یا بچے، عزیز و اقارب کو چھوڑنا، بچپن جن گلی کوچوں میں گزرا، اُن سے جدائی، ساتھی سنگیوں سے مفارقت، اجنبی ماحول میں اجنبی لوگوں کے ساتھ زندگی کی روش کیا ہوگی؟ اس سوال میں کتنے ہی سوال چھپے ہوئے ہیں۔

نبوت کے پانچویں سال میں جب مسلمانوں پر ظلم و جبر کی کوئی انتہا نہ رہی تو حضور ﷺ نے اپنے رفقا کو ہجرت کی اجازت عطا کی۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فیصلہ ''اندھیرے میں تیر'' نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے نبوی بصیرت اور ربانی ہدایت کے تحت ہجرتِ صحابہؓ کے لئے حبشہ کا انتخاب کیا۔ بعض شہادتوں کے مطابق سرورِ کائنات ﷺ نجاشی سے ذاتی طور پر واقف تھے، اور اس بات کو بھی آپ نے اہمیت دی کہ حبشہ والے وحیٔ الٰہی اور پیغامِ ربانی کے سلسلے سے واقف تھے۔ آخرت کا تصور اُن کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ ہادیٔ برحق ﷺ نے نبوت کے تیرہویں برس میں ہجرت کی اور اُس سے کئی سال پہلے صحابہؓ

کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہجرت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ حقیقت مسلمانوں کے ساتھ آپ ﷺ کی شفقت اور رحمت کا ثبوت ہے۔ آپ اللہ کے پیغام کی تبلیغ کے لئے اُسی جگہ مقیم رہے جہاں آپ کو مبعوث فرمایا گیا تھا، جہاں کفر کے سردار جمع تھے، جہاں اندھیروں میں آپ ﷺ کی تبلیغ کی روشنی سعید روحوں کے لئے ہدایت کا راستہ بن رہی تھی، جہاں کے قیام سے آنے والے برسوں میں یثرب کو مدینۃ النبی ﷺ اور اسلامی ریاست کا مرکز بننا تھا۔

حضور ﷺ نے حبشہ کا انتخاب کرتے ہوئے اوّلین مہاجرین سے فرمایا کہ وہاں کا حکمراں کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہاں اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی سبیل پیدا کرے گا۔ آپ کے اس اعتمادِ کامل کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ پہلے قافلۂ مہاجرین میں آپ ﷺ کی صاحب زادیٔ حضرت رُقیہؓ اور آپ کے داماد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ یہ قافلۂ اوّل گیارہ مردوں اور چار خواتین پر مشتمل تھا۔ خواتین کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ حبشہ میں مسلمانوں کی سلامتی ایک واقعے کی طرح اللہ نے آپ ﷺ کی نظروں کے سامنے پیش کردی تھی۔

ہجرت صرف خاتم الانبیا ﷺ کی سنت نہیں ہے، بلکہ یہ سنتِ انبیا علیہم السلام ہے، اور حضور کے جد اور ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ اس سنت کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت رسولِ کریم ﷺ تک، اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تاریخ اور جغرافیہ دونوں کو بدل دیا اور اس عقیدے کو ہماری زندگیوں کا عنوان بنا دیا:

ہر مُلک مُلکِ ما است

قرآنِ کریم کے مطابق ہجرت نقلِ مکانی کا نام نہیں بلکہ یہ ربّ العزت کی طرف سفر ہے، اور اس سے بڑی اخلاقی صفت اور کیا ہوسکتی ہے کہ دُنیا سے منہ موڑ کر انسان یکسوئی کے ساتھ اپنے ربّ کا ہو لے۔

حضرتِ لوط، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ وہ اپنے چچا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے۔ گمراہی زمین پر اس طرح پھیل گئی تھی کہ دنیا کے مختلف علاقوں کو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی ضرورت تھی:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ O (۱)

پس لوط (ابراہیم پر) ایمان لے آئے اور کہنے لگے میں اپنے ربّ کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ وہ ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

میں اللہ کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں (اِنّی مُھاجر الی ربّی)۔ یہ سیاق وسباق میں حضرت ابراہیمؑ کا قول معلوم ہوتا ہے لیکن اس بات کا بھی قرینہ ہے کہ یہ بات حضرت لوطؑ نے کہی ہو اور تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات دونوں نے کہی ہو، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ حضرت لوط علیہ السلام نے بھی ہجرت فرمائی اور وہ سدوم کے علاقے میں ہدایت کے لئے بھیجے گئے۔ اللہ تعالیٰ انبیائے کرام کے لئے اُن کی بستیوں کا انتخاب فرماتا تھا، یہاں تک کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ساری دنیا کے لئے مبعوث فرمائے گئے۔

دو رسولوں کو ہجرت کا حکم دیا جارہا ہے اور اُن کا ردِعمل یہ ہے کہ جو ذات ہمیں اجنبی سرزمینوں میں بھیج رہی ہے وہ صاحبِ حکمت ہے اور اُس کے اس حکم میں جو مصالح اور حکمتیں ہیں وہ اُن سے پوری طرح واقف ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہر غلبہ اُسی کا ہے اور اُسی کا حکم اور امر غالب ہو کر رہے گا۔ ہجرت کے وقت اللہ پر رسولوں کے توکل کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی اندیشہ اُن کی جمعیتِ خاطر کو پریشان نہیں کرسکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ اس طرح رہے کہ اُن کی ہدایت کے لئے سرگرداں اور اُن کے کفر سے بے زار تھے۔ جب اُن کی قوم نے اُن سے اپنے قومی تہوار میں چلنے کے لئے کہا تو فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ O (۲) ''میں بیمار ہوں''۔ اس چھوٹے سے کلمے انی سقیم میں قوم کے ساتھ رسول کے تعلق کی پوری داستان سمٹ آئی ہے۔ مراد ہے کہ تمہارا طرزِ زندگی میرے لئے سب سے بڑا روگ ہے۔ یہاں سقیم میں بیماری کے ساتھ بیزاری کا مفہوم بھی سمٹ آیا ہے جو خود ایک بیماری یا بیماری کی علامت ہے۔ مختلف زبانوں میں یہ پیرایۂ بیان موجود ہے۔ کسی بات سے انتہائی بے زاری کے لئے انگریزی زبان کا بھی محاورہ ہے: I am sick of it

جب قوم والے اپنے تہوار میں شرکت کے لئے چلے گئے تو حضرتِ ابراہیمؑ نے اُن کے معبد میں اُن کے بتوں کو توڑ ڈالا تاکہ وہ اپنے معبودوں کی بے بسی اور بے کسی کو دیکھ لیں۔ یہی وہ موقع ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اور آگ آپ پر گلزار ہوگئی۔ کفار کی اس شکست کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اعلان فرمایا:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ O (۳)

اور (ابراہیم نے) کہا کہ میں تو اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں (ہجرت کرنے والا ہوں)۔ وہی میری رہنمائی کرے گا۔

ان آیاتِ قرآنی سے ہجرت کا حقیقی مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ انبیائے کرام کو اپنا پیغام اور انسانوں کی ہدایت ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ وہ وطن کی فضاؤں، گھر کے آرام، احباب کی محفلوں، مانوس ماحول اور ہر آرام وعیش کو اشارۂ ربی پر قربان کرنے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو صرف ظلم سے بچنے کے لئے ہجرت کا حکم نہیں دیا بلکہ آخری رسول ﷺ نے اقصائے عالم میں اسلام کو پھیلانے کے لئے صحابہؓ کو حبشہ جانے کی اجازت دی۔ ویسے یہ بات اس باب میں یاد رکھنے کی ہے کہ ہجرت، جدوجہد کے ایک نئے مرحلے کا نام ہے۔ کردار میں مسلسل جدوجہد کے جذبے کو زندہ رکھنے کے لئے ہجرت وسیلۂ قوی ہے، اسی لئے ہم نے ہجرت کو اخلاق نبی ﷺ واخلاق صحابہؓ کا عنوانِ جلی قرار دیا ہے۔ ہجرت فی سبیل اللہ، کے بعد بھی جہاد وسعی فی سبیل اللہ، جاری رہتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس ترتیب اور رفاقتِ ہجرت وجہاد کو واضح فرمادیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ O (۴)

بے شک جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا (اور مسلسل جدوجہد کی) وہی اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جَاهَدُوْا سے جہاد بالسیف کے ساتھ ساتھ مسلسل جدوجہد اور کوشش بھی مراد ہے۔ حبشہ کے مہاجرینِ اوّل نے تبلیغی کاوش کی اور مدینے ہجرت کرنے والوں نے بھی نبی اکرم ﷺ کے ساتھ میدانِ کارزار میں حق کی سربلندی کے لئے جہاد بالسیف کا حق ادا کیا۔

انتہائی نامساعد حالات میں مہاجرینِ حبشہ کی ہجرت نے مہاجرینِ مدینہ کی ہجرت کی طرح اس حقیقت کو روشن تر کردیا:

وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّسَعَةً (۵)

اور جو کوئی اللہ کے راستے میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں بہت سی قیام گاہیں (اور ٹھہرنے کے مقام) پائے گا اور کشادگی ووسعت بھی۔

اللہ کا وعدہ ان شاء اللہ تا قیامِ قیامت مہاجروں کے لئے وجہِ تسلی رہے گا اور یوں ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

ہجرت مسلمانوں کی کتنی ہی اخلاقی صفات کے لئے وجہِ محرکہ ہے۔ گزشتہ سطور میں ہم نے یہ خیال

پیش کیا ہے کہ ہجرت نے جغرافیہ کو بھی بدل دیا اور تاریخ کو بھی۔ جغرافیہ اسلامی نظریۂ قومیت کے تحت بدل گیا اور مسلمان قیدِ مکانی سے بلند تر ہو گیا۔ ہجرت نے مسلمان کی قومیت کے عُقدے کو حل کر دیا۔ مسلمان ایک قوم ہے۔ ایسی قوم جو زمین پر ایک وحدت کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس قومیت کی اساس کلمۂ طیبہ ہے۔ آج ہمارے دور میں عالم گیریت (Globalization) کا بڑا چرچا ہے۔ یہ عالم گیریت اور اس کا تصور ہجرت کا ثمرہ ہے۔ اسی نے پوری زمین کو ہمارے لئے مسجد بنا دیا۔ ہجرت محض ایک واقعہ نہیں بلکہ مسلمان کی زندگی کا آئین ہے اور مسلمان کو اسی آئین کی بدولت ثبات حاصل ہے۔ ہجرت نے ہمیں کائنات کے سمندر میں مچھلی کی طرح زندہ رہنا سکھایا ہے اور یوں مسلمان قیدِ مقامی سے بلند تر ہو گیا۔

عُقدۂ قومیتِ مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد — بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تا نہ بخشہائے آں سلطانِ دیں — مسجدِ باشد ہمہ روئے زمیں
ہجرت آئین حیاتِ مسلم است — ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

نبوت کے چھٹے سال میں مہاجرین کا دوسرا قافلہ حبشہ پہنچا، جس میں ۸۳ مرد اور ۱۸ عورتیں تھیں۔ اِنمیں حضرت جعفر بن ابی طالب بھی شامل تھے۔ حضرت جعفر کو نبیٔ اکرم ﷺ نے نجاشی کے نام خط بھی دیا تھا جس میں اُسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ اپنی رسالت پر کامل ترین ایمان اور اللہ تعالیٰ پر حد درجے کا توکل تھا۔ جس حکم راں کی مملکت میں مسلمان امن کی تلاش میں ہجرت کر رہے تھے اُس کی خیر خواہی کا تقاضا تھا کہ اُسے ابدی عافیت اور نجات کی طرف بلایا جائے۔ رسول ﷺ کی دعوت نے نجاشی کے قلب کی دُنیا بدل دی اور اُس نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ (۶)

اتنی بڑی تعداد میں مکہ معظّمہ کے جگر گوشوں کی ہجرتِ حبشہ ایک بڑا واقعہ تھی جس سے قریش کی دُنیا زیر و زبر ہو گئی۔ یہ نکتہ بڑا اہم ہے کہ مسلمانوں کی ہجرت سے قریش کے دل لرز اُٹھے۔ اسلام کا یہ سفر اُنہیں ایک عالمی یلغار محسوس ہونے لگا اور اُنہوں نے حبشہ ایک سفارت بھیجنے کا فیصلہ کیا جس میں عمرو بن العاص اور ابوجہل کا بھائی عبداللہ بن ابی ربیعہ شامل تھے۔ اُن کے ساتھ نجاشی کے لئے بیش قیمت تحائف بھیجے گئے۔

نجاشی نے قریش کے وفد کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا، لیکن مسلمانوں کو اُن کے حوالے کرنے کے بجائے اس نے اگلے دن مسلمانوں کو بھی اپنا مؤقف پیش کرنے کے لئے اپنے دربار میں بلایا، حالانکہ اُس کے ممتاز مشیروں اور پادریوں نے مکہ کے وفد کی حمایت کرتے ہوئے مسلمانوں کو واپس بھیجنے کا مشورہ دیا تھا۔

مسلمانوں نے نجاشی کے دربار میں حاضری دیتے ہوئے اُس سے اجازت طلب کی ''بادشاہ سلامت! اللہ والے آپ سے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں'' حق پسند اور خدا آشنا نجاشی کو یہ اذن طلبی بے حد پسند آئی اور جب مسلمان دربار میں پہنچے تو اُس نے قریش کے دونوں ایلچیوں سے پوچھا کہ کیا ان مسلمانوں میں سے کوئی غلام ہے جو اپنے مالک سے بھاگ کر یہاں آیا ہو؟ عمرو ابن ربیعہ کا جواب نفی میں تھا۔ نجاشی نے دریافت کیا کہ ''کیا ان مہاجروں میں سے کسی پر تمہارا قرض ہے، جو اُس نے ادا نہ کیا ہو؟'' جواب پھر نفی میں تھا۔ آخر کہا تو یہ کہا کہ ''یہ لوگ دین آبا سے پھر گئے ہیں اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں''۔ نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ توحید، رسالت، یوم آخرت، عدل اور مساوات کے ذکر کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی۔ جعفرؓ کے لبوں سے آیاتِ الٰہی چشمۂ ہدایت کی طرح جاری ہوگئیں۔ نجاشی، اُس کے درباریوں اور عیسائی پادریوں اور راہبوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ حضرتِ زکریا، حضرت یحییٰ علیہما السلام کی پیدائش کے بعد حضرت مریمؑ کا قصہ شروع ہوا۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ (۷)۔ کس طرح جبرئیلِ امینؑ اُن کے پاس آئے اور کس طرح پاک اور کنواری مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بنیں، اور کس طرح اپنی قوم کی طرف لوٹیں:

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا O يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۚ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا O قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۙ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۙ وَّبَرًّا ۢ بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا O وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا O (۸)

پس مریم اپنے بچے کو لئے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں۔ وہ لوگ کہنے لگے اے مریم! تو نے بری بات کی۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں، باغی اور بے راہ تھی۔ مریمؑ نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ قوم والے کہنے لگے کہ ہم گہوارے میں لیٹے اس بچے سے کیسے بات کریں۔ اس پر بچے نے کہا کہ میں عبداللہ ہوں اور میرے اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے اپنا نبی بنایا ہے اور مجھے بابرکت بنایا ہے۔ اور میں

جہاں بھی رہوں اور جب تک زندہ ہوں اُس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ اور اُس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا ہے اور اُس نے مجھے سرکش اور شقی نہیں بنایا ہے اور مجھ پر اُس دن بھی سلام ہے جب میں پیدا ہوا، اور جو میری موت کا دن ہے اُس دن بھی مجھ کو سلام، اور جس دن مجھے دوبارہ زندہ کیا جائے اُس دن بھی مجھ پر سلام۔

مسلمانوں نے اُس دن بھی پامردی، استقلال اور تبلیغ کا حق ادا کیا، جس دن اُن کے مستقبل کا فیصلہ ہونا تھا۔ حضرت مریم علیہ السلام کی عصمت کی ایسی واضح اور حتمی شہادت تو بائبل کے الفاظ میں بھی نہیں تھی، اور کس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کی جگہ اُن کی زبان سے عبداللہ کہا گیا اور کس طرح اُن کے وجود کی برکات بیان کی گئیں۔ نجاشی کے دربار میں موجود پادریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ''ابن اللہ'' ہونے سے انکار پر غوغا مچا دیا، مگر نجاشی نے کہا کہ عیسیٰ کے پیدا کرنے والے ربّ کی قسم! عیسیٰ نہ اس سے کم تھے اور نہ زیادہ۔ قرآن کی آیات نے ابن مریم کی عظمت و صداقت کو اس طرح پیش کیا تھا کہ صداقت دل میں اُترتی جاتی ہے۔ نجاشی نے قریش کے وفد کے تحائف واپس کر دیئے اور وہ نامراد مکہ معظمہ واپس چلے گئے۔ (۹) صبر اور سچ مومن کے کیسے حربے ہیں جو کفر، شرک اور جھوٹ کی جڑ کاٹ دیتے ہیں۔

یہ صبر ایک مسلسل اور جاری مرحلہ ہے بلکہ یہ مراحل کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ وہ جماعت تھی جس نے کہا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور اُن میں سے بیشتر اپنے اس قول پر یوں جم گئے کہ باری تعالیٰ کی توحید کی شہادت اُن کی زندگی بن گئی۔ یہ حضور ﷺ کا صبر اور استقامت تھی جو مومنوں کے لئے نمونہ بنی اور وہ قرآنِ عظیم کی اس آیت کی تجسیم بن گئے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ (۱۰)

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور اس قول (وعقیدہ) پر وہ ڈٹ گئے اور جم گئے، اُن پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے اور اس قول کے ساتھ کہ نہ خوف کرو اور نہ حزن اور تمہیں اُس جنت کی بشارت ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

نازل ہونے والی چیز ہمارے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ اپنا خارجی وجود رکھتی ہے۔ وحی کی طرح فرشتے بھی اپنا وجود رکھتے ہیں اور ہم اُن کے وجود کو اُس کیفیت سے جان سکتے ہیں جو اُن کی موجودگی ہماری ذات میں پیدا کرتی ہے۔ فرشتوں کا نزول انسانوں میں سکینہ پیدا کرتا ہے، جیسے میدانِ بدر میں

فرشتے اُس نصرت کے قاصد اور پیغام بر بن کے آئے، جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ فرشتے طائف کے سفرِ نبوی ﷺ اور اُحد وحنین کے میدانِ کارزار میں نازل ہوئے اور اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی استقامت میں اضافہ کیا، شکست کو میدانِ اُحد میں ایسی فتح میں بدل دیا کہ دشمن اپنی ظاہری فتح کے ثمرات سے محروم رہا اور حُنین میں رسول اللہ ﷺ کی آواز پر

اَنَا النَبی لا کذب اَنَا ابن عبدُالمُطلب

مجاہدوں کے اُکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور فتح نے اس استقامت کے قدم چومے۔

یہ سارے واقعات صبر اور استقامت کی دستاویزیں ہیں، ہم نے نبیٔ کریم ﷺ اور سابقین الاولین کے صبر کے چند واقعات آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ حرمِ کعبہ میں رسولِ آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ قریش کے مظالم کو بھی اجمالاً پیش کیا گیا، لیکن جناب ابوطالب پر قریش کے دباؤ اور اُن کی استقامت کا ذکر ابھی باقی ہے۔

قریش کے سردار بنو ہاشم کے سربراہ جناب ابوطالب کی خدمت میں وفود کی شکل میں کئی بار گئے اور اُن سے درخواست کی کہ اپنے بھتیجے کو ''نئے دین'' کے پرچار سے روکیں۔ ابوطالب کمالِ دانش مندی سے ان وفود کو بغیر کسی یقین دہانی کے واپس بھیج دیتے۔ آغازِ تبلیغ عام میں ایسا ایک وفد آیا اور اپنی بات کہہ سن کے واپس لوٹ گیا۔ دوسرے وفدِ قریش نے سوال جواب کی جگہ اپنے مؤقف کو دوٹوک انداز میں بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے پاس آئے اور آپ نے ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع نہیں کیا۔ اب معاملہ حد سے گزر چکا ہے۔ آپ یا تو اپنے بھتیجے کو ہمارے معبودوں کی تذلیل سے منع کریں یا اُس کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔ پھر ہمارے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ ہم میں سے ایک فریق ختم ہو جائے گا۔ اس دھمکی کے بعد سردارانِ قریش واپس لوٹ گئے۔ ابوطالب نے حضور ﷺ کو بلا کر کہا کہ بھتیجے! اب قریش کے سرداروں کا تنِ تنہا مقابلہ میرے بس کی بات نہیں۔ حضور ﷺ اپنے چچا کے انتہائی شکر گزار تھے، مگر تبلیغ تو حکمِ خداوندی تھی۔ جس طرح دریا اپنی روانی کو روکنے پر قادر نہیں، جس طرح طوفانِ برق وباراں کی رفتار اُس کے قابو میں نہیں ہوتی، اُسی طرح سرورِ کائنات ﷺ اپنی تبلیغی کاوش پر قدغن نہیں لگا سکتے تھے۔ اُن کے ربّ نے اُن کو اسی فریضے کی تکمیل کے لئے بھیجا تھا اور وہ پہلے وفدِ قریش سے کہہ چکے تھے کہ جس طرح آفتاب اپنی حرارت کو کم اور زیادہ کرنے پر قادر نہیں اسی طرح مجھے تبلیغ کو روکنے پر قدرت نہیں۔ دوسرے وفد کے جانے کے بعد جناب ابوطالب نے اپنے بھتیجے کو اس سلسلے میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی تو

آپ ﷺ نے اُس کے جواب میں جو بات کی وہ تاریخِ استقلالِ انسانی کے گلے میں پڑے ہار کی طرح آج بھی جگمگا رہی ہے:

> چچا جان! ربِ محمد کی قسم: اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو بھی میں تبلیغ کے سلسلے کو نہیں روک سکتا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ نازل فرمادے۔ اُس کا دین غالب ہوکر رہے، یا میں دنیا سے گزر جاؤں۔ (۱۱)

شعب ابی طالب

جنابِ ابوطالب نے اپنے بھتیجے کو اپنی حمایت کے جاری رکھنے کا یقین دلایا۔ اس کے بعد ابوطالب نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کا اجتماع منعقد کرایا، اور اُس اجتماع میں محمد (ﷺ) پر قریش کے دوسرے قبائل کے ممکنہ حملے اور آپ کے قتل کے اندیشے کے پیشِ نظر بنو ہاشم اور بنو مطلب قبائلی عصبیت کی بنیاد پر متفق ہوگئے، اور آپ کی حفاظت پر آمادہ ہوگئے۔ کافر اپنا مکر کر چکے تھے اور یہ ربِ محمد کی تدبیر تھی کہ اُس نے قبائلی عصبیت کو ایک نیا رنگ عطا کردیا۔ اب بنو ہاشم اور بنو مطلب کے مسلم اور غیر مسلم دوسرے قبائل کے مقابل حضور ﷺ کا ساتھ دینے پر متفق ہوگئے۔

حضرت محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے اصحابؓ کی حفاظت کا ربِ جلیل نے یوں انتظام فرمایا کہ قبائلِ مکہ اور بنی ہاشم اور بنی مطلب کے درمیان قبائلی امتیاز وتفرق کا مسئلہ یوں کھڑا ہوگیا کہ مسلم اور غیر مسلم کی تمیز کے بغیر بنی ہاشم اور بنی مطلب کے معاشرتی ومعاشی انقطاع (بائیکاٹ) کا فیصلہ کیا گیا۔ تمام مسلمانوں کو معاشرے سے الگ کردینا یوں ممکن نہ تھا کہ دسوں بڑے قبائل میں مسلمان ہوجانے والے قابلِ ذکر تعداد میں موجود تھے اور ان دوسرے قبیلوں کے مسلمانوں کے بائیکاٹ سے خانہ جنگی پیدا ہونے کے امکانات تھے۔ اس پس منظر میں بنی ہاشم، بنی مطلب اور بنی عبدمناف کے مقاطعے پر دوسرے قبیلوں نے ایک عہدنامہ مرتب کیا۔ اس عہدنامے میں کسی مدت کا تعین نہ تھا بلکہ مقاطعہ غیر معین مدت کے لئے تھا جب تک کہ حضور ﷺ کے قبیلے والے آپ کو اُن کے حوالے نہ کردیں۔ اُس عہدنامے کے مطابق بنی ہاشم، بنی مطلب اور بنی عبدمناف کے ساتھ لین دین مطلقاً ختم کردیا گیا، باہمی شادی بیاہ پر پابندی عائد کردی گئی، اُنہیں آزادانہ بازاروں میں جانے سے منع کردیا گیا، اُن سے بات چیت اور مجلسوں میں اُن کی شرکت پر پابندی عائد کردی گئی۔ اس مقاطعے کے جواب کے طور پر بنی ہاشم میں طے کیا گیا تھا کہ وہ

ایک جگہ رہیں اور اپنی پناہ گاہ کے طور پر شعبِ ابی طالب کا انتخاب کیا۔

اس معاہدے کی تحریر یکم محرم ۷ نبوت کو مرتب کی گئی۔ نئے سال کا آغاز اس طرح کیا گیا کہ حضرت نبیٔ کریم ﷺ اور اُن کے اہلِ قبیلہ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ یہ گھاٹی آج بھی بیت الحرام کے قریب ہی ایک بازار کی صورت میں موجود ہے۔ اسلام دشمنی میں کتنے ہی حقائق قریش والوں کی نظر سے چھپ گئے۔ اب تک تو بنی ہاشم، بنی مطلب اور بنی عبد مناف کے لوگ اسلام کی مخالفت کی وجہ سے نبیٔ اکرم ﷺ کے خلاف تھے اور ان میں سے بعض تو اپنی دشمنی میں دوسروں سے آگے تھے، لیکن جب ''اسیری'' اور ''مقاطعہ'' اُن کے درمیان قدرِ مشترک بن گیا تو ان کا ذہنی ردِّ عمل اسلام اور نبیٔ اکرم ﷺ کے بارے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر ہمہ وقتی جبری ساتھ نے اُنہیں اس تبدیلی کے مطالعے کا موقع فراہم کیا جو اسلام نے اُن کے مسلمان ہو جانے والے اہلِ قبیلہ میں پیدا کر دی تھی۔ جب کھانے کو کچھ نہ ملتا اور درختوں کے پتے، چھال اور چمڑے کو اُبال کر نگلنے کا موقع آتا تب بھی ان مسلمانوں کے لبوں پر الحمدللہ کے سوا کوئی اور بات نہ ہوتی۔ فاقے کی صورت میں اگر کوئی ہمدرد کسی مسلمان کو کھانے کی کوئی چیز چھپ چھپا کر دے جاتا تو وہ خود کھانے کی بجائے کسی اور مستحق کو دے دیتا اور اس بات میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تفریق نہیں کرتا۔ حضور نبیٔ کریم ﷺ کے غیر مسلم اہلِ قبیلہ یہ بھی دیکھتے اور حیرت کے ساتھ کہ ان تکالیف میں بھی سرکارِ مدینہ ﷺ اور آپ کے رفقائے کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کس دل جمعی کے ساتھ اپنے ربّ کی عبادت کرتے ہیں اور کس طرح بیمار اور کسی تکلیف میں مبتلا اہلِ قبیلہ کی خدمت کرتے ہیں، مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر۔ اس طرح دیکھنے والی آنکھوں، تجزیہ کرنے والے ذہنوں اور محسوس کرنے والی روحوں میں اسلام اپنی جگہ بناتا رہا اور محصوری کا یہ دور دلوں میں اسلام کے جاگزیں ہونے کا دور بن گیا۔ (۱۲)

اس احصار کا ایک اور اہم اور مثبت نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ قریش کے قبائل کے کتنے ہی دلوں میں اس ظلم کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہوا۔ یہ اخلاقی داعیہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے اور یہ گمراہیوں کے عہد میں بھی افراد کے دلوں کو روشن رکھتا ہے۔ اس ظالمانہ عہد نامے کے خلاف کئی قریشی نوجوانوں کے دلوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ لوگ شعب ابی طالب میں چپکے چپکے کھانے پینے اور ضرورت کی دوسری چیزیں پہنچا دیتے۔ ہشام بن عمرو بن حارث، زبیر ابن ابی اُمیہ، ہشام مطعم بن عدی، ابوالبختری اور زمعہ بن اسود ایک دوسرے سے اس عہد نامے کو ختم کرنے کے صلاح مشورے کرتے رہے۔ اُدھر اللہ جل جلالہ نے اپنے رسول ﷺ کو اطلاع دی کہ کعبے کی چھت پر رکھے اس عہد نامے کو دیمک نے چاٹ کر

بے معنی نقش ونگار میں بدل دیا ہے۔ ایک دن جب یہ نوجوان مسجد الحرام میں عہد نامے کو چاک کرنے کی بات بلند آواز میں کر رہے تھے تو جنابِ ابو طالب حرم میں داخل ہوئے اور اُنہوں نے فرمایا کہ میرے بھتیجے کو اللہ تعالیٰ نے اس عہد نامے کے مٹائے جانے کی اطلاع دی ہے۔ میرے بھتیجے کے منہ سے آج تک کوئی غلط بات نہیں نکلی ہے۔ عہد نامہ منگوا کر دیکھو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو عہد نامہ منسوخ اور اگر عہد نامہ سلامت ہے تو میں محمد (ﷺ) کو تمہارے حوالے کرنے پر تیار ہوں۔ کفارِ قریش فوراً آمادہ ہو گئے اور جب کعبے کی چھت پر سے عہد نامہ اُتار کر دیکھا گیا تو اُس پر سوائے باسمک اللّٰھم کے الفاظ کے کوئی لفظ دیمک کا چارہ بننے سے نہیں بچا تھا۔ یوں یہ عہدِ محصوری ختم ہوا اور بنی ہاشم، بنی مطلب، بنی عبد مناف اپنے گھروں کو لوٹے۔ (۱۳) ہم نے اس واقعے کو قدرے تفصیل سے لکھا ہے، اگرچہ ایامِ احصار میں ساتھیوں کی حالت اور پریشانی کے واقعات کو دانستہ چھوڑ دیا ہے۔

اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اہلِ ایمان کے صبر اور استقامت سے وقت اور تاریخ کے دھارے کس طرح مڑ جاتے ہیں۔ یہ صبر مجبوری کا نام نہیں بلکہ اہلِ ایمان کے اختیار کی داستاں ہے۔

یہ صبر اور استقامت، عزم کا اظہار ہے۔ اور اُولوالعزم رسولوں کا امتیاز ہے اور رسول اللہ ﷺ رسولانِ اُولوالعزم کے سردار تھے۔ اس سلسلۂ رسالت کی طرف قرآنِ حکیم بار بار ہماری توجہ مبذول کراتا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ۚ (۱۴)

پس اے رسول ﷺ! آپ ایسا صبر کریں، جیسا اُولوالعزم رسولوں نے کیا، اور ان کے لئے عذاب طلب کرنے میں عجلت نہ کریں۔ یہ جس دن وہ عذاب دیکھ لیں گے جس کا اِن سے وعدہ کیا جاتا ہے تو ان کو محسوس ہوگا کہ یہ دن کی صرف ایک گھڑی دنیا میں رہے تھے۔

شعب ابی طالب میں قیام اور اُس کے شدائد کے پس منظر میں اس آیت کے معانی روشن تر ہو جاتے ہیں۔ اس ڈھائی تین سال کی مدت میں سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ مکۂ معظمہ میں تو تبلیغ نہیں کر سکے لیکن قرب و جوار کی بستیوں اور قافلوں کی شاہراہوں کا رُخ فرماتے اور اُن تک اسلام کا پیغام پہنچاتے۔ ابولہب ان مواقع پر بھی آپ ﷺ کے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھتا اور مختلف قافلے والوں کے سامنے آپ کے بارے میں نازیبا باتیں کرتا۔ لوگ جب آپ ﷺ کے کلماتِ حق اور حکمت سے پُر گفتگو کا اُس کے ہزوات سے مقابلہ کرتے تو آپ کا کارِ تبلیغ آسان تر ہو جاتا۔ اسی زمانے میں بنی سلیم، بنی نصر، بنی حارث،

بنی غسان، بنی کعب، بنی خزیمہ اور کئی دوسرے قبیلے والوں سے آپ ﷺ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ آپ کے چہرۂ اقدس پر رسالت کے نور اور آپ کے کلام میں حکمت کے تابندہ گوہر دلوں پر اثر ڈالتے رہے اور ذہنوں کی فضا اسلام کے لئے ہموار ہوتی گئی۔

عام الحزن اور سفرِ طائف

وہ نبوت کا دسواں سال تھا کہ آپ ﷺ کے سر سے شفقت کا وہ سائبان ہٹ گیا جس کا نام ابو طالب تھا۔ جناب ابو طالب کی زندگی حضور نبیٔ کریم ﷺ کی حمایت اور حفاظت میں کٹی، لیکن آخری وقت میں عمائد قریش کی موجودگی میں آپ ﷺ کی زبان سے کلمۂ طیبہ ادا نہ ہو سکا، کہ کہیں قبیلے والے اسے بزدلی کی علامت نہ سمجھیں۔

جناب ابو طالب کی وفات کے چند دن کے بعد وہ ذات بھی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئی جس نے سب سے پہلے آپ ﷺ کی تصدیق کی تھی اور آپ پر ایمان لائی تھی، جس کی رفاقت آپ کے لئے سکینہ اور باعثِ سکون تھی، جسے جبرائیلؑ کی معرفت ربِ محمد ﷺ نے اپنا سلام بھیجا تھا، جس ذات کے وسیلے سے رب العزت نے آپ کو غنا عطا کیا اور جو ہمیشہ آپ کے خانۂ دل میں ایک زندہ وجود کی طرح مقیم رہی، جس کی روشنی پچیس سال تک کاشانۂ نبوت میں پھیلی رہی اور جس کی سہیلیوں اور اعزہ کے ساتھ حسن سلوک معمولِ حضرت خیر البشر ﷺ رہا۔ ان دونوں ہستیوں کے انتقال کی وجہ سے یہ سال عام الحزن کہلایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کا مہینہ وہی ہے جو ماہِ نزولِ قرآن ہے، یعنی رمضان المبارک ۱۰ رسالِ نبوی۔ (۱۵)

ایک طرف تو زندگی میں یہ غم والم، دوسری طرف قریش والوں کے ظلم وستم، مگر اس عالم میں اللہ کا رسول ایک لمحے کے لئے بھی اپنے فریضۂ تبلیغ ورسالت سے غافل نہیں رہا۔

ابولہب سردارِ بنو ہاشم کی حیثیت سے چند دن تو آپ ﷺ کا حامی رہا، پھر لات کی جھوٹی خدائی سے اُس کی محبت جاگ اُٹھی اور پھر مکۂ معظمہ آپ ﷺ کے لئے ایک اجنبی اور نامہربان شہر بن گیا، جہاں کوئی آپ ﷺ کی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان حالات میں آپ نے فیصلہ کیا کہ طائف جا کر تبلیغ کریں۔ مکۂ معظمہ اور طائف کو ان دونوں شہروں کے لوگ ''توام شہر'' کہتے اور سمجھتے تھے بہ قرینتین۔ نبوت کی ماہیت، وظائف اور عظمت سے بے خبر ان بڑے شہروں کے سردار، اہل ثروت اور مترفین نبوت کو بھی اپنا حق جانتے تھے۔ نبیٔ اکرم ﷺ کے علوئے نسب، ذاتی کردار، امانت، صداقت اور دیانت کے قائل ہوتے

ہوئے بھی وہ مال و دولتِ دُنیا کی بنا پر نبوت کو بھی ان دونوں شہروں کے کسی صاحب ثروت کا حق سمجھتے تھے۔ جب نبیٔ اکرم ﷺ پر قرآنِ حکیم کا نزول شروع ہوا تو دنیاوی جاہ وحشمت اور مال ومتاع کے ان اسیروں نے اُسے جادو قرار دیا اور کہنے لگے:

وَلَمَّا جَآءَ هُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌوَّ اِنَّابِهٖ كٰفِرُوْنَ O وَقَالُوْا لَوْ لَانُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ O اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ط نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَO (۱۶)

اور جب اُن کے پاس حق آیا تو کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے۔ ہم اس (کو ماننے) سے انکار کرتے ہیں اور کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا؟ کیا آپ ﷺ کے ربّ کی رحمت کو یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے اس دُنیوی زندگی میں اِن کے درمیان معیشت (اور متاعِ دُنیا) تقسیم کردی اور (اسبابِ حیات میں) ایک کو دوسرے سے بلند تر کردیا ہے تاکہ ایک دوسرے کو (اپنا) ماتحت بنالے۔ اور آپ ﷺ کے ربّ کی رحمت اُس سے بہتر ہے جسے یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں کفر کے ذہن کی ساخت، اُس کا اندازِ فکر سب کچھ آ گیا ہے اور اُس پر ربانی تبصرہ بھی۔ اس دھیمے لہجے میں ان کے استدلال کی جڑ کٹ گئی کہ کیا آپ کے ربّ کی رحمت کو یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ پھر اللہ جل جلالہٗ کا عدل اور اُس کی ربوبیتِ عامّہ کو بھی نظر میں رکھیے کہ اُس نے متاعِ دُنیا اور اسبابِ معیشت اُن بندگانِ دُنیا کو خوب عطا کردی جو اُسے سب کچھ سمجھتے تھے۔ پھر اللہ کی اُس رحمت میں اُن کا حصہ کیوں جس کا تعلق اس دُنیا کی متاع سے نہیں بلکہ آخرت اور ابدی زندگی سے ہے۔

نبیٔ کریم ﷺ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں تمسخر اور ظلم کے سلسلوں سے مسلسل گزر رہے تھے۔ آپ کی قوت آپ کے ربّ کی رفاقت تھی اور اسی رفاقت کے پیشِ نظر آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ ﷺ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں کے لوگوں کے سامنے دعوتِ حقِ اسلام پیش کریں۔ طائف اور اُس کے جوار سے آپ کے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ بی بی حلیمہ کا قبیلہ بنی سعد اسی علاقے کے نواح میں رہتا تھا۔

آپ ﷺ شوال ۱۰ نبوت میں حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ طائف کے تاریخی تبلیغی سفر پر روانہ

ہوئے اور وہاں تقریباً بیس روز قیام فرمایا۔ یہ سفر فرائض نبوت کی ادائیگی کی ایک کڑی تھا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کہ کیا تم گواہی دو گے کہ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا؟ ہر صحابی نے کہا کہ آپ نے نصیحت، گواہی اور تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کی اس شہادت پر انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا ''اے اللہ! تو گواہ رہنا''۔

اس آنے والی شہادت کا تقاضا تھا کہ آپ طائف تشریف لے جاتے۔ الحمدللہ ہم بعد میں آنے والے مسلمانوں کی سعادت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پہلے پیش آنے والے واقعات کو بعد میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں اور اُن کے ربط کی تفہیم کر سکتے ہیں۔

جب آنحضرت ﷺ طائف پہنچے تو آپ بنی ثقیف کے سرداروں عبد یالیل، مسعود اور حبیب سے ملے اور اُنہیں اسلام کی دعوت پیش فرمائی۔ یہ تینوں انتہائی گستاخی اور تکبّر کے ساتھ آپ سے پیش آئے۔ ان کے جملے شمشیر سے زیادہ تیز اور تیر سے زیادہ دل میں پیوست ہو جانے والے تھے۔ کون سا حرفِ دشنام تھا جو ان بھائیوں کے منہ سے ادا نہ ہوا، کون سا حرفِ تحقیر تھا جو انہوں نے داعیٔ الی اللہ ﷺ کے لئے استعمال نہیں کیا۔ بات صرف رسول تک محدود نہ رہی بلکہ ان تینوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات، اُس کے انتخاب اور اُس کی دانش کا بھی مذاق اُڑایا۔ اُن کے استہزائی کلمات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ کردار کی عظمت، بے غرضی، ضبطِ نفس اور اپنے پیغام کو اپنی ذات پر مقدم رکھنے کی مثال سفر طائف کا ایک ایک لمحہ ہے۔ افسوس کہ ہم اپنے قلم کو اُن گستاخانہ باتوں کی نقل سے معذور پاتے ہیں جنہیں نبیٔ اکرم ﷺ نے استقلال کے پہاڑ کی طرح برداشت کیا اور ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔

بنی ثقیف کے ان شقی القلب سرداروں نے اوباش اور بدنہاد آوارہ لڑکوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا کہ وہ آپ کا تعاقب کریں، جہاں آپ ﷺ کسی سے تبلیغ کرنے کی کوشش کریں، آپ کا مذاق اُڑائیں اور آپ ﷺ پر خشت باری کریں۔ ان اوباشوں نے آپ پر پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔ ان بدبختوں کا طریقۂ کار یہ تھا کہ حضور جب قدم اُٹھاتے تو ان میں سے کچھ آپ کے ٹخنوں کو نشانہ بناتے اور کچھ آپ کے جسم کے دوسرے حصوں پر ضرب لگاتے۔ آپ ﷺ کا جسم لہولہان ہو گیا اور ٹخنوں سے بہنے والے لہو سے نعلینِ مبارک خون سے چپک گئے۔ حضرت زید بن حارثہؓ نے آپ کی سپر بننے کی کوشش کی اور اُن کا سر پھٹ گیا۔ یہ اُن چند موقعوں میں سے ایک تھا جب رحمتِ دو عالم ﷺ کے لبوں پر شکوے کے الفاظ آئے۔ آپ ﷺ نے اپنے ربّ سے عرض کیا:

اے الٰہی! میں تجھ سے اپنی ناطاقتی، وسائل کی کمی اور لوگوں کی ناقدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الرحمین! تو بے کسوں اور کمزوروں کا ربّ ہے۔ تو میرا بھی ربّ ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے، اُن کے حوالے، جو مجھ سے سختی سے پیش آئیں، یا تو کسی دشمن کو مجھ پر اختیار دے رہا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ تیری عافیت میرے لئے وسیع اور کافی ہے۔ میں تیرے چہرۂ کریم کی پناہ چاہتا ہوں جو ظلمات کو نور میں بدل دیتا ہے۔ مجھے صرف تیری رضا مطلوب ہے یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے اور تیرے سوا نہ کسی میں زور ہے اور نہ طاقت۔

ادھر سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لبوں سے یہ دُعا نکلی اور اُدھر ظلمات کو نور میں بدلنے والے ربّ نے دو تاریک دلوں کو رحم دلی کے نور سے جگمگا دیا۔ حضرت زید بن حارثہؓ آپ ﷺ کو اُٹھا کر شہر سے باہر لے گئے اور ایک باغ میں پناہ لی۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا جو مکۂ معظمہ کے رئیس زادے تھے۔ ان دونوں نے صادق و امین ﷺ کو اس حال میں دیکھا تو قرابت اور برادری کے سوئے ہوئے جذبے میں تحریک پیدا ہوئی۔ انہوں نے اپنے عیسائی غلام عداس کو انگور کا ایک خوشہ دے کر کہا کہ اُس زخمی کو دے آؤ۔ غلام نے خوشۂ انگور حضرت ختم المرسلین ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر تناول فرمانا شروع کیا۔ غلام نے حیرت سے کہا کہ ''یہ کلمات یہاں کے لوگ تو نہیں کہتے''۔ رسول اللہ ﷺ نے اُس سے دریافت کیا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ ''میں عیسائی ہوں اور نینوا کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام عداس ہے''۔ ''تو تم یونس بن متی کے علاقے کے باشندے ہو؟''۔ غلام نے حیرت سے پوچھا: ''آپ یونس بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟''۔ ''یونس بن متی اللہ کے نبی تھے اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔ یونس بن متی میرے بھائی تھے''۔ یہ سن کر عداس جھکا اور اُس نے رسول اللہ ﷺ کے سر پر بوسہ دیا، اور پھر آپ کے ہاتھ پاؤں عقیدت سے چومے۔ ربیعہ کے بیٹے دور سے دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے سے کہا ''لو، یہ غلام تو ہمارے ہاتھ سے گیا''۔ جب غلام لوٹ کر اپنے مالکوں کے پاس پہنچا تو اُنہوں نے ماجرا دریافت کیا۔ غلام نے کہا ''آقا! آج پوری دنیا میں اس سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ اس نے مجھے ایسی بات بتائی ہے جو ایک نبی کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا''۔

قدرے باغِ ربیعہ میں آرام کر کے رسول اللہ ﷺ نے مکے کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا۔ راستے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ملے۔ روح الامینؑ تنہا نہیں تھے بلکہ اُن کے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ

بھی تھا۔ اُس نے خدمت حضرت رسالت مآب ﷺ میں یہ گزارش پیش کی کہ آپ حکم عطا فرمائیں تو میں اہلِ طائف اور اہلِ مکہ کو پہاڑوں کے درمیان پیس کر ہلاک کردوں۔ (۱۷) رحمت للعالمین ﷺ کی نظروں کے سامنے وہ مشرک بھی تھے جنہیں ایمان لانا تھا اور مشرکوں کی وہ اگلی نسلیں بھی، جنہوں نے اسلام کی روشنی سے مشرق ومغرب کو روشن کرنا تھا۔

یقیناً اللہ تعالیٰ نے نافرمانی کے سبب پچھلی قوموں پر عذابِ عام نازل فرمایا اور اُس وقت جب اُن لوگوں میں کوئی رجلِ رشید (بھلا آدمی) نہیں تھا اور اُن کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ حضرت محمد ﷺ تو مرسلِ آخر تھے اور مکے میں اُن کی دس سال کی تبلیغ اور جدوجہد کے نتیجے میں ایسے لوگ بڑی تعداد میں مسلمان ہوگئے تھے جو اپنی اپنی جگہ ایک اُمت تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کہیں یہ بات تحریر فرمائی ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کی بعثت محض ایک رسول کی بعثت نہیں تھی بلکہ رسول کے ساتھ ایک اُمت بھی مبعوث فرمائی گئی تھی:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (۱۸)

تم بہترین اُمت ہو، جو انسانوں کے لئے نکالی گئی (پیدا کی گئی)۔ تم معروف (بھلائی) کا حکم دیتے ہو اور برائی (منکر) سے روکتے (اور منع) کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔

آلِ عمران مدنی سورت ہے، لیکن خیر اُمت کا وجود اور قیام تو مکۂ معظمہ میں ہو چکا تھا اور آلِ عمران کی اگلی ہی آیت میں فرمایا گیا ہے:

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ط وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ف ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ O (۱۹)

یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، سوائے ستانے کے، اور اگر انہیں تم سے قتال کرنا پڑے تو یہ پیٹھ دکھا دیں گے اور ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

سورۂ آلِ عمران کی آیات نمبر ۱۱۰ اور ۱۱۱ میں اگرچہ تخاطب اہلِ کتاب سے ہے، لیکن عملاً اور تاریخی طور پر کفار بھی اس وعید اور پیش گوئی کے مخاطب ہیں۔

جیسا کہ ہم عرض کر رہے تھے کہ مکۂ معظمہ کے اس ابتدائی دور میں ہر ایمان لانے والا ایک اُمت کی طرح تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت عثمان بن عفان، حضرت حمزہ، حضرت عمر، حضرت زید بن حارثہ، حضرت مصعب، حضرت بلال، حضرت عمار بن یاسر، حضرت یاسر، حضرت سمیہ، حضرت

خباب بن ارت، حضرت اُمِ عبیس، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ارقم، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبید اللہ بن جراح، حضرت سعید بن زید، حضرت جعفر بن ابی طالب، حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ اجمعین، غرض کہ ناموں کی کہکشائیں ہیں جو ہمیشہ آسمانِ صبر واستقلال وجانثاری پر روشن رہیں گی اور ہر دورِ جبر میں انسانوں کو حوصلہ دیتی رہیں گی۔

ہم یہ بات پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضور ﷺ کے اخلاقی اوصاف ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوکر ایک کُل اور ایک جہانِ اخلاق کی تعمیر کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ایک رفیق کے ساتھ سفرِ طائف اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد کی بے مثال، مثال ہے۔ پھر طائف میں آپ پر ظلم اور خشت باری بھی سلسلۂ تبلیغ کو نہ روک سکی۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ربیعہ برادران کے قلب کی تبدیلی ایک معجزہ تھی اور اُس گوشۂ عافیت میں عداس کی آمد آپ ﷺ کے سلسلۂ تبلیغ کے تسلسل کا سبب بنی۔ حضور نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صبر کا ایسا مظاہرہ کیا کہ آپ کا شکوہ بھی حمد بن گیا۔ زبان پر قابو اور مصائب کے درمیان اللہ کا شکر بہترین اخلاقی وظائف ہیں اور آپ کا پہاڑوں کے فرشتے کی پیش کش کو قبول نہ فرمانا اولوالعزمی کی انتہائی بلندی ہے۔ ویسے بھی یہ سنتِ الٰہی ہے کہ جس بستی میں رسول موجود ہو اُس پر عذاب نازل نہیں کیا جاتا اور اہلِ حق کے لئے سفرِ طائف کا ابدی پیغام یہ ہے کہ نصرتِ الٰہی بے شک مومنوں کے لئے آتی ہے لیکن اس عالمِ اسباب میں حق و باطل کی جنگ اہلِ حق کو خود لڑنا پڑتی ہے۔ میدانِ بدر میں سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ کی دُعائے نصرت کے جواب میں آسمان سے فرشتے نازل ہوئے۔ مگر مولانا ماہر القادری کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کی دعا پر صحابۂ کرامؓ کی تلواریں آمین کہہ رہی تھیں اور پھر جنگِ بدر اس حقیقت کی شہادت ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا و کار ساز

بدر میں رسول اللہ ﷺ نے جو مٹھی بھر خاک فوجِ کفار کی طرف پھینکی اور جس کا اثر ہر آنکھ پر ہوا، اُسے اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل قرار دیا ہے:

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (۲۰)

اور خاک کی مٹھی آپ نے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی اور (یہ اس لئے) مسلمانوں کو اپنی طرف سے اُن کی محنت کا خوب معاوضہ عطا کرے۔ بے شک اللہ سمیع وعلیم ہے۔

قرآنِ حکیم نے یہ بات واضح کر دی کہ نصرتِ الٰہی مومنوں کی کوشش اور جد وجہد کا معاوضہ اور انعام ہے۔ سورۂ انفال کی محولۂ بالا آیت میں اسی اجرِ الٰہی کا ذکر ہے۔ اس انعام کی صورتیں اور نوعتیں اتنی متنوع اور اتنی تسکین آور اور روح پرور ہیں کہ ان اجور وانعامات کے ملنے سے پہلے آدمی اُن کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ واقعۂ طائف کتنا شدید اور گراں بار تھا، اس کا اندازہ بخاری شریف کی ایک روایت سے ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک دن ہادیٔ اعظم اور صابرِ اعظم ﷺ سے دریافت فرمایا کہ آپ ﷺ کی زندگی میں اُحُد کے دن سے زیادہ سخت کوئی دن گزرا ہے، تو زوجِ عائشہ نے طائف کو سب سے سنگین مصیبت کا دن بتایا۔ (۲۱) ان سنگین حالات میں حضرت روح الامین کی آمد آپ ﷺ کے لئے ایک بڑا اجر تھی۔

سفرِ طائف کی مدت کے تعین میں اختلاف ہے۔ اربابِ سیر نے یہ مدت دس دن اور بعض نے بیس دن بتائی ہے۔ جب نبیٔ اکرم ﷺ واپسی کے سفر میں وادیٔ نخلہ پہنچے تو وہاں کئی دن قیام فرمایا اللّٰہ غنی۔ شب و روز کا خالق اس طرح اپنے حبیب کی ذہنی کیفیت اور آپ ﷺ کے زخموں پر مرہم رکھ رہا تھا۔ یہیں جنّات کی ایک جماعت کو خالق انس وجن نے اپنے رسول کی خدمت میں بھیج کر آپ ﷺ کو رسولِ جن و بشر کے مرتبۂ عالیہ پر فائز فرما دیا۔ جنوں کے اس وفد کی آمد کا سورۂ احقاف اور سورۂ جن میں ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ جن کی ابتدائی دو آیات ہی سے اس جماعتِ اجنہ کے مسلمان ہو جانے کی تصدیق ہوتی ہے:

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝ (۲۲)

اے نبی! آپ (ﷺ) کہہ دیں کہ مجھے وحی کے ذریعے اطلاع دی گئی ہے کہ اجنہ کی ایک جماعت نے قرآن سنا اور اُنہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب (قدرت اور حکمت والا) قرآن سنا ہے جو رشد و ہدایت کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس کتاب پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز اپنے ربّ کے ساتھ شرک نہیں کریں گے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجنہ کی آمد کا احساس اور علم آپ ﷺ کو نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ عزوجل نے وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو اس کی اطلاع دی، اور یہ کہ یہ جماعتِ جنّات ایمان لے آئی۔ یہ طائف کے شدائد کے بعد آپ کے عزمِ تبلیغ پر انعامِ الٰہی تھا۔ قول اجنہ قرآناً عجباً میں قرآنِ حکیم کی عظمت، ہمہ گیری، وسعت، حقائق اور تاثیر یہ سب باتیں کس طرح سمٹ آئی ہیں۔ سفرِ طائف میں آپ

کے استقلال اور صبر کا یہ انعام تھا کہ عالمِ بشریت کے ساتھ ساتھ عالم جنات بھی آپ کے زیرِ نگیں آ گیا۔ نبوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الف الف سلاماً کا یہ عجب پہلو ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت سے قبل اجنہ اکثر انسانی معاملات میں مداخلت کرتے تھے اور اثر انداز ہوتے تھے۔ آپ کی نبوت کے بعد یہ سلسلۂ دخل اندازی کم وبیش ختم ہو گیا، اور اجنہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ (۲۳)

اہلِ یثرب سے رابطہ

سفرِ طائف کے بعد تبلیغ کی راہیں آسان ہوئیں۔ یثرب محض ایک شہر نہ تھا بلکہ ایک الگ دُنیا تھا، جہاں اہلِ کتاب اور بالخصوص یہود آباد تھے۔ اہلِ یثرب کے کان ایک آنے والے نبی کا مژدہ سن چکے تھے اور یہود اپنی ''بالادستی'' کے لئے اُس نبی کے انتظار میں تھے۔

حج کے ایام میں نبیٔ اکرم ﷺ اطراف و جوانب سے آئے ہوئے قبیلوں کی قیام گاہوں پر جا کر توحید اور آخرت و اعمالِ صالحہ کا پیغام پیش کرتے۔ کوئی قابلِ ذکر قبیلہ ایسا نہیں تھا جس تک رسول اللہ نے اپنے ربّ کے دین کی دعوت نہیں پہنچائی ہو، مگر ان لوگوں کے دل تو پتھر سے زیادہ سخت تھے۔

ایک دن سرورِ کائنات ﷺ نے چھ آدمیوں کو دیکھا جو اُس وقت کے مروّجہ مناسکِ حج کے بازے میں سنجیدہ تھے۔ آپ کے دریافت کرنے پر اُنہوں نے بتایا کہ وہ یثرب سے آئے ہیں اور بنی خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرکارِ عالی مقام ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے پاس میری کچھ باتیں سننے کا وقت ہے، اُنہوں نے کہا کہ ضرور ضرور آپ فرمائیں، ہم سنیں گے۔ یہ یثربی دوسرے قبیلے والوں سے مختلف تھے۔ حضور ﷺ نے قرآنِ حکیم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی۔ یثربی کلماتِ ربانی بھی سن رہے تھے اور چہرۂ مبارک پر ان آیتوں کے نور کا پرتو بھی دیکھ رہے تھے۔ یثربیوں نے ایک دوسرے سے بات کی اور کہا کہ یقیناً یہ وہی نبی ہیں جن کی آمد سے یہود ہمیں ڈراتے رہتے ہیں۔ آؤ ہم یہود سے پہلے ان کا دامن تھام لیں۔ ہم بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی عداوت ہمارا شعار ہے۔ شاید اللہ ان کے ذریعے ہمیں متحد کر دے۔ ان یثربیوں نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ ہم آپ پر ایمان لاتے ہیں۔ واپس جا کر آپ کی دعوت اپنے قبیلے والوں کو پہنچائیں گے۔ ہم اگلے سال پھر آئیں گے اور اگر حالات ہمارے موافق ہوئے تو ہم آپ ﷺ کو یثرب لے جائیں گے۔ آپ ﷺ اپنے اللہ سے دُعا فرمائیں۔ یثرب کے یہ ''سابقین الاوّلین'' حضرت عوف بن حارث، حضرت رافع بن مالک، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابوامامہ اسعد، حضرت قطبہ بن عامر اور حضرت عقبہ بن عامر

تھے۔ان ناموں میں کچھ اختلاف بھی ملتے ہیں،اور بعضوں نے چھ کی جگہ آٹھ کی تعداد لکھی ہے۔

ان چھ آدمیوں نے توحید، آخرت، اعمالِ صالحہ اور حضرت محمد مجتبیٰ ﷺ کی رسالت کا اپنے قبیلے میں خوب چرچا کیا۔اور نتیجتاً اگلے موسمِ حج میں بارہ یثربی آلِ اسمٰعیل کے نبی کی زیارت کے لئے مکہ معظمہ آئے۔اُن میں پانچ افراد وہی تھے جن سے سالِ گزشتہ آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی تھی۔یہ ازلی سعادت نصیب ایمان لائے اور اُنہوں نے آپ ﷺ کے دستِ حق نما پر بیعت کی۔یہ بیعتِ عقبۂ اولیٰ ہے۔ان حق پرستوں نے عہد کیا کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے،اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے،زنا کے قریب بھی نہیں پھٹکیں گے،کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور امر بالمعروف میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں گے اور فراغت ہو یا تنگی اپنے عہد و پیمان کو پورا کریں گے۔

بیعت کی ان دفعات سے اسلام کے اطراف و جوانب اور حدود و وسعت اور انسان سازی کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ان چند باتوں میں اسلام کی روح سمٹ آئی ہے اور ہر دور کے لئے اُسوۂ حسنہ اور اسلام کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے۔مسلمان سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدت کا اقرار کرتا ہے،اور اس حقیقت پر ایمان لاتا ہے،اسی کے ساتھ وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لاتا ہے۔اس بیعت میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔اس کے بعد اس بیعت میں قتلِ اولاد سے باز رہنے کا عہد ہے۔یہ عہد معاشرے کی تعمیر اور اُس کی ترتیب کا عہد ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر ایمان کا اعلان ہے۔زنا نہ کرنے کا عہد معاشرے میں ہمواری اور اعتماد علی النسب کی دفعہ ہے۔یہ حقوق العباد اور معاشرے میں اعتماد کی فضا قائم رکھنے کا پیمان ہے۔نبی کریم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ فرد اور معاشرے کے ہر پہلو کا احاطہ کر لیتا ہے اور انسانی زندگی اور معاشرے میں فساد کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔بہتان باندھنے سے دور رہنے کا عہد ایک اہم حق العباد کی بجا آوری کی طرف قدم ہے۔معاشرے میں ہر آدمی تہمت، الزام اور ہتکِ عزت سے محفوظ رہے۔یہ بنیادی انسانی حق ہے۔سرورِ کائنات ﷺ نے مسلمان کی شخصیت، ذات اور کردار کی تعمیر اس طرح کی کہ انسانی ذات بھی نشوونما پائے اور معاشرے میں بھی کردار کا بحران پیدا نہ ہو۔آج ہمارے معاشرے کو جتنے مسائل کا سامنا ہے معاشی ناہمواری، ظلم، دوسروں کی حق تلفی، لوگوں کا اپنے فرائضِ منصبی کو انجام نہ دینا، رشوت، بلند و بالا عمارتوں کی ایسی ناقص تعمیر کہ زلزلے کا ایک جھٹکا اُنہیں زمیں بوس کر دے، پلوں اور فلائی اوورز میں ناقص سامانِ تعمیر اور لاپروائی سے انسانی زندگیوں کو خطرہ، سیاست دانوں کے جھوٹ اور فریب کا سلسلہ، باہمی عدم اعتماد، معاشرے میں جرائم کی

کثرت، خواتین پر زیادتی۔ ان میں سے ہر جرم کارشتہ کردار کے بحران سے ہے۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ کے بعد ان یثربی مسلمانوں کی درخواست پر حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے یثرب بھیجے گئے۔ (۲۴) اُن کی ذات، اندازِ کلام، آیاتِ ربانی کے اثر اور اسلام قبول کرنے والے ساتھیوں کے اندازِ زیست میں تبدیلی۔ یہ سب باتیں تبلیغ بن گئیں۔ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ اگلے سال بیعتِ عقبۂ کبیرہ منعقد ہوئی اور یثرب کے مسلمانوں کی تعداد ستر سے تجاوز کرگئی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عرب وعجم کی مخالفت کی ''قیمت'' پر رسول اللہ ﷺ کی ''رفاقت'' کا انتخاب کیا۔

یثرب کے مسلمانوں سے دونوں بیعتوں کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا ساتھ مختصر وقت کے لئے ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کی صحبت ''آیتِ الٰہی'' تھی جو دلوں کی دنیا کو یکسر منقلب کر دیتی تھی اور آپ ﷺ ایک ایسا آئینہ تھے جس میں سعید روحوں کی سعادت چمک کر سامنے آجاتی تھی اور شقی و فاسد ارواح کی شقاوت اور خسران دو چند ہو جاتا۔ اصغر گونڈوی نے اس بڑی صداقت کو کس طرح دو مصرعوں میں سمیٹ لیا ہے:

فروغِ حسن سے تیرے چمک اُٹھی ہر شے
ادا و رسمِ بلالی و رسمِ بولہبی

حضور ﷺ کا دیدار، آپ کی صحبت، آپ کی رفاقت کا کوئی بدل نہیں ہے اسی لئے ''صحابیت'' کا درجہ اہلِ ایمان میں سب سے افضل ہے۔ اُس جیسی جماعت پر اُس سے پہلے سورج نہیں چمکا، اور یہ شرف و کرامت قیامت تک کسی اور فرد یا جماعت کو نصیب نہیں ہوگی۔ اس نکتے سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کا یہ پہلو ہمارے سامنے آتا ہے کہ آپ کے اخلاق کے مشاہدے سے صحابہؓ اخلاقی درجاتِ عالیہ پر فائز ہو جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ معلمِ اعظم بھی تھے اور آپ معلم بنا کر مبعوث فرمائے گئے: ''انــا بــعــثــت مــعــلـماً'' اور یہ ایسا معلم تھا جو تلامذہ کا ساتھی بھی تھا۔ اسلام کے دورِ اوّل میں صبر و ایثار، پامردی کے علاوہ آپ کے اخلاق کے یہ دونوں پہلو بھی مجسم ہو کر سامنے آئے۔ آپ کا تعلیم دینا آپ کے اخلاقِ عالیہ سے جڑا ہوا تھا اور معلم و متعلم میں رفاقت اتنی مضبوط تھی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے رفقاء کے ''صاحب'' اور رفیق تھے۔ قرآنِ حکیم نے آپ کی ذات اور اخلاق کے اس پہلو کا ذکر فرمایا ہے:

مَابِصَاحِبِکُمْ مِنْ جِنَّۃٍ ط اِنْ ھُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ O (۲۵)

تمہارے اس رفیق (محمد ﷺ) کو کوئی جنون نہیں ہے، بلکہ وہ تو نذیر ہیں جو تمہیں ایک

شدید عذاب سے ڈراتے ہیں۔

داعی اور جماعت، نبی اور اُمت، معلم اور متعلم کا ایسا تعلق اور قربت، دعوت اور اخلاق کی دُنیا میں نہ تو اس سے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد۔ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رفاقت ہر مرحلے میں آپ کے اخلاق میں شامل رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہؓ کے ہمیشہ رفیق اور صاحب رہے۔ بیتِ ارقم میں سرکارِ دو عالم ﷺ اُنہیں تعلیم دیتے ہوئے، صبر کی تلقین کرتے ہوئے، اُن کے زخموں کو اپنے دستِ مبارک کی شفا بخشی سے مندمل کرتے ہوئے اور اپنی دُعاؤں سے اُن کے دکھ کا مداوا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مدینۂ منورہ میں آپ ﷺ اُن کے ساتھ مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی کی تعمیر میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ اپنے مبارک ہاتھوں سے پتھر اُٹھاتے ہیں، صحابۂ کرامؓ آپ ﷺ کو روکتے اور کہتے اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان، آپ آرام فرمائیں۔ مگر آپ مسکرا کر اپنے کام میں مصروف رہتے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر آپ خندق کھودنے میں لگے رہتے اور جو چٹان کسی کی کدال سے نہ ٹوٹتی وہ ضربِ محمد ﷺ سے پاش پاش ہو جاتی۔ عام دنوں میں آپ اپنے صحابہؓ کے ساتھ مسجدِ نبوی میں گفتگو کرنے اور اُنہیں تعلیم دینے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ زندگی کی تلخیاں آپ ﷺ کی شیریں محفل میں آسان ہو جاتیں۔ کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوتا تو آپ اپنے صحابہؓ کو ادبی تنقید کے نکات سے آگاہ فرماتے، کبھی صحابہؓ کے مسائل کو حل فرماتے اور اگر کسی محفل میں صحابۂ کرامؓ میں سے کوئی آپ ﷺ سے آپ کی کوئی پسندیدہ چیز طلب کرتا تو آپ بلا تأمل اُس کے حوالے کر دیتے، بالخصوص رمضان المبارک میں آپ ﷺ کی فیاضی نسیمِ بہار کی طرح نظر آتی۔ یہ باتیں اور ان سے متعلق تفاصیل اپنے اپنے مقام پر بیان کی جائیں گی، ان شاء اللہ۔

معراج

طائف کے سفر کے بعد حالات جس طرح بدلنے لگے اُن کا بیان اختصار کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ عام الحزن، شعب ابی طالب میں محصوری، تمسخر اور مظالم کے طغیان اور سفرِ طائف کے شدائد کے بعد رحمتِ الٰہی نے ہوا کا رخ بدل دیا، اجنہ کا مسلمان ہونا، اہل یثرب میں اسلام کی اشاعت۔ یہ تو زمین کی باتیں ہیں، لیکن ربّ العالمین کے پاس رحمۃ للعالمین کے لئے ورائے زمین بھی ایک بڑا انعام تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے کردار، اپنے عمل، اپنے صبر، اپنی بے غرضی سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ انسانوں کے لئے

بہترین نمونہ ہیں اور اس کا اجر معراجِ انسانیت ﷺ کو معراج کی صورت میں عطا ہوا۔ خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ساتھ یہ اُن کی اُمت کی بھی معراج تھی۔ صوفیائے کرام کے تجربات تو شخصی ہو سکتے ہیں لیکن انبیائے عظام کے تجربات اور علوئے مرتبہ کا تعلق اُن کی اُمت سے بھی ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ تو ختم الرسل تھے اس لئے اُن کے ہر روحانی تجربے اور خاص طور پر معراج کا تعلق اُن کی اُمت اور آنے والے زمانوں کے سارے انسانوں سے تھا۔ نمازِ پنج وقتہ اسی سفرِ معراج میں اللہ رب العزت کی طرف سے حضور ﷺ کی اُمت کو تحفہ اور عطا کے طور پر ملی۔ نماز زمین والوں کے لئے وہ عطائے ربّ تھی جو اُنہیں اپنے خالق سے ملاتی ہے۔ نماز اللہ تعالیٰ کے ساتھ مومن کی سرگوشی ہے اور نماز کی ماہیت اور اہمیت حضور ﷺ کے اس ارشاد میں سمٹ آئی ہے:

الصلوٰۃ عماد الدین (۲۶)

نماز مسلمان کی معراج ہے۔

یہ واقعہ نبوت کے بارہویں سال میں پیش آیا۔ عام روایات کے مطابق وہ رجب المرجب کی ۲۷ ویں شب تھی۔ (۲۷) توقیتِ نبوی ہمارا شعبہ نہیں اور ہمارے اس مطالعے میں توقیت کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے، اہمیت تو اس حقیقت کو حاصل ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ ﷺ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معراج، اسلام کے پھیلاؤ اور زمیں گیری کا دیباچہ تھی، اور کئی اعتبار سے یہ ہجرت کا اشارہ نما اور پیش خیمہ تھی۔ حضور ﷺ نے تو آسمانوں اور کئی زمانوں کی سیر کی اور انفس و آفاق میں اللہ تعالیٰ کی آیات کا مشاہدہ کیا۔ یہ اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اُن کے دیں کی زمیں گیری اور آفاق نوردی کا دور شروع ہونے جا رہا ہے۔

معراج، ہجرت اور عالم گیریت

سورۂ بنی اسرائیل میں واقعۂ معراج اور دعائے ہجرت دونوں یکجا ہوگئی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ بھی جو فتحِ مکہ کے موقع پر اس وقت نبی کریم ﷺ کے لبوں پر تھے جب آپ اپنی چھڑی سے اُن بتوں کو ضرب لگا رہے تھے جو کعبے میں براجمان تھے اور چھڑی کی یہ ضرب ان کی معزولی کا اعلان تھی۔

سورۂ بنی اسرائیل کو سورۃ الاسراء بھی کہتے ہیں کہ اس کا آغاز نبی اکرم ﷺ کے اس سفر سے ہوتا ہے

جس کے پہلے مرحلے میں آپ مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تشریف لے گئے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ O (۲۸)

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی، جس کے ماحول اور آس پاس کو ہم نے برکت عطا کی ہے تاکہ ہم اُسے (اپنی قدرت کی) آیات دکھائیں، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

واقعۂ معراج سرورِ کائنات ﷺ کے مرتبہ عالی کا اعلان ہی نہیں بلکہ اسلام کی عالمگیریت کا اظہار بھی ہے، شبِ معراج اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے وقت اور فاصلوں کو اپنے رسول ﷺ کے لئے مُسخر فرما دیا، آج ہم عالمگیریت (Globalization) کے عہد میں قدم رکھ رہے ہیں، جس کا نقطۂ آغاز معراج مصطفیٰ ﷺ تھی۔ اس لئے عالمگیریت اور دنیا کا ایک عالمی بستی میں بدل جانا ہمارے لئے تردد کی بات نہیں بلکہ وہ بشارت ہے جو معراج کے واقعے سے پیدا ہوئی جو ہم سے کہہ رہی ہے کہ مومن ایام کا مرکب نہیں بلکہ راکب ہے۔ الحمدللہ علیٰ ذالک۔ وقت کی یہ تیز رفتاری اور یہ تیز تر ذرائع ابلاغ واقعۂ معراج کے منطقی نتائج ہیں۔

واقعۂ معراج کے تقریباً ایک سال کے بعد ہی رسولِ پاک ﷺ کی ہجرت پیش آئی۔ معراج اگر رسول اللہ ﷺ کی تکریم کی تحریر جلی تھی تو ہجرت اسلام کی زمیں گیری کا آغاز تھی کیونکہ محمد ﷺ کو خاتم الانبیاء مرسلین بنا کر بھیجنے والے نے یہ اعلان بھی تو فرما دیا تھا کہ محمد عالمِ انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اعلان کو مستحکم تر بنانے کے لئے رب العزت جل جلالہ نے یہ اعلان سرکارِ ختمی مرتبت کی زبان سے کرایا۔

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا نِ الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ج لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ص فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَ کَلِمٰتِہٖ وَ اتَّبِعُوْہُ لَعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ O (۲۹)

آپ کہہ دیجئے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں جس کی سلطنت تمام آسمانوں اور زمین پر (قائم) ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، وہی حیات عطا کرتا ہے اور وہ ہی (تمہیں) موت دیتا ہے، پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی اُمی پر (ایمان لاؤ) جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اُس کے احکام پر، اور ان کا اتباع کرو تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔

اس سے پہلے کی آیت میں بھی رسول اللہ ﷺ کے اتباع کے ثمرات کی بات ہو رہی تھی اور واضح ترین الفاظ میں یہ حقیقت بیان کی گئی تھی:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۳۰)

اور جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور (قرآن) کی پیروی کرتے ہیں جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا، وہ ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

معراج کے سفر کی تفاصیل ہمیں سیرتِ مبارکہ کی بیشتر کتابوں میں ملتی ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انبیائے کرام کی جماعتِ نماز کی امامت فرمائی اور نماز کے بعد کس کس آسمان پر کس کس نبی سے آپ کی ملاقات ہوئی، اور سدرۃ المنتہیٰ کی داستاں بہت سی باتوں کے بیان کے باوجود اسرار و رموز کے پردوں میں نہاں ہے۔ آپ کے علوئے مرتبہ کی اس روئداد میں ان آیات کا ذکر بھی ملتا ہے جو آپ کے سامنے پیش کی گئیں، اس میں برزخ کے وہ احوال بھی ہیں جن کا حضور ختمی مرتبت ﷺ نے مشاہدہ فرمایا، صاحبِ مقام محمود اخلاق حمیدہ کے مالک تھے، اور آپ کے فضائل اخلاق سے انسانیت کے شرف کا اندازہ ہوتا ہے۔ برزخ کے احوال سے آپ کو تاریخ کے مختلف ادوار میں رذائل اخلاق سے روشناس کرایا۔ وہ قومیں جنہوں نے ربانی تعلیمات کو قبول نہ کیا، اپنی سرکشی کے سبب حدود کو توڑا اور معصیتوں کو اختیار کیا ان کے تذکروں میں ہماری اخلاقی اصلاح کے کتنے ہی باب موجود ہیں۔ ہادیٔ اعظم حصہ اول میں سید فضل الرحمٰن نے احوالِ برزخ کے عنوان کے تحت فتح الباری، شامی، تفسیر ابن کثیر، زرقانی، ابن ہشام، عیون الاثر، حلبی، مسند احمد وغیرہ کے حوالوں سے یہ احوال پیش کئے ہیں۔ (۳۱)، آپ ﷺ نے دیکھا کہ ''کچھ لوگوں کی زبانوں اور ہونٹوں کو آگ کی قینچیوں سے کاٹا جا رہا تھا۔ جبریل نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے خطیب و واعظ ہیں جو لوگوں کو گمراہی میں ڈالتے ہیں''۔ (۳۲) آپ نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں۔ آپ نے مشاہدہ فرمایا کہ ان کے ''ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کے مشابہ ہیں، ان کے ہاتھوں میں آگ کے ٹکڑے ہیں جو پتھر کی مانند ہیں اور وہ ان کے منہ میں ڈالے جاتے ہیں اور ان کی پشت سے نکل جاتے ہیں''۔ (۳۳) آپ نے ایسے لوگوں کو دیکھا جن کے سامنے پاکیزہ اور فربہ گوشت ہے اور ان کے ایک طرف لاغر اور بدبودار گوشت ہے، وہ پاکیزہ اور فربہ گوشت کو چھوڑ کر لاغر اور بدبودار گوشت

کھاتے ہیں۔ آپ کے استفسار پر حضرت جبریل نے بتایا کہ ''یہ وہ لوگ ہیں جو ان عورتوں کو چھوڑ کر جو اللہ نے ان کے لئے حلال کی ہیں، ان عورتوں کی طرف جاتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے حرام کی ہیں''۔ (۳۴)

اپنے مشاہدات برزخ کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں ایک ایسی قوم پر گزرا جن کے پیٹ کوٹھریوں کی مانند تھے اور ان میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو باہر سے نظر آرہے تھے، میں نے کہا کہ اے جبریل یہ کون لوگ ہیں، جبرئیل امین نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں''۔ (۳۵)

اس سلسلے میں نماز سے روگردانی کرنے والوں، حقوق و امانت ادا نہ کرنے والوں کا انجام اور عذاب بھی پیش کیا گیا ہے اس میں ہمیں اسلام میں اخلاق کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ شب معراج کے مشاہدوں میں اخلاق کی جو آیات سامنے آتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی ہمیں عذاب برزخ اور دائمی عذاب جہنم سے نجات دلاسکتی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی دعائے ہجرت اور اذنِ ہجرت ہمیں اس آیت میں ملتی ہے:

قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا O (۳۶)

اور (اے رسول) دعا کیا کیجئے کہ اے رب مجھے جس جگہ لے جایئے اچھی طرح لے جایئے اور جہاں سے نکالئے اچھی طرح نکالئے اور اپنی جناب سے میرے لئے غلبہ، اقتدار اور نصرت عطا فرمایئے۔

اس آیت کو مفسرین قرآن حکیم نے ہجرت کے پس منظر کو سمجھا اور سمجھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معراج کے بعد اپنے رسول کو ہجرت کی خبر اور اس کے نتیجے میں اسلامی ریاست کے قیام کی نوید سے نوازا اور اس دعا سے یہ بات ہم پر واضح ہوجاتی ہے کہ دعا عبادت کا مغز اور خلاصہ ہے۔ دعا سے انسان اور اس کے رب کے درمیان رشتہ رفاقت میں بدل جاتا ہے اور یہی رفاقت اخلاق کی اساس بنتی ہے۔ یہ قربت صرف اللہ کا خوف ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ حبِ الٰہی کی بنیاد بنتی ہے اور حبِ الٰہی کا نسخہ قرآنِ حکیم کے مطابق اتباعِ رسول ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ O (۳۷)

کہہ دیجئے (اے مسلمانو!) اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری مغفرت فرمادے گا اور اللہ تعالیٰ بے حد

مغفرت کرنے والا اور مہربان ہے۔

ہجرت نبوی کی توقیت ہمارا موضوع نہیں، ہمارا موضوع حیاتِ نبوی کے مختلف پہلوؤں سے اخلاق کا تعلق ہے، لیکن واقعے کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم ہجرت کی تاریخوں کا ذکر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پرانے اور نئے سیرت نگاروں کی بیان کردہ تاریخوں کا ذکر کرتے ہوئے سید فضل الرحمٰن نے جرح وتعدیل کے بعد ہجرت کی تاریخوں کا درج ذیل نقشہ مرتب کیا ہے

مکہ سے غار کی طرف روانگی	یکم ربیع الاول
غار ثور میں آمد	یکم ربیع الاول
غار میں قیام	۴ ربیع الاول تک
غار سے روانگی	۵ ربیع الاول کی صبح
قبا میں آمد	۱۲ ربیع الاول
قبا میں قیام	۱۵ ربیع الاول تک
مدینہ روانگی اور آمد	۱۶ ربیع الاول (۳۸)

و جعلنی من لدنک نصیرا، اور اللہ تعالیٰ نے ہجرت بندی کو اقتدار، نصرت اور غلبے کا وسیلہ بنا دیا۔ یثرب میں اوس اور خزرج میں قبائلی رقابت تھی اور اس رقابت کو یثرب کے یہود بڑی عیاری کے ساتھ اپنی بالادستی کے لئے استعمال کر رہے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ زبور کی روشنی میں آخری نبی کے منتظر تھے، اور مشرکینِ یثرب سے یہی کہتے تھے کہ اس نبی کی آمد سے ہمارے غلبے اور نصرت کی تکمیل ہوگی، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ نبی اولادِ اسحاق میں ہوگا، لیکن رب العزت نے آخری نبی کی بعثت اولادِ اسماعیل میں فرمائی۔ یثرب کے یہود نے جب سرورِ کائنات کو دیکھا، ان کی باتیں سنیں، ان کے نبی ہونے کا ان کے قلب نے اعتراف کر لیا مگر عناد وحسد میں اس نبی کی نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس سے وہ اپنی اولاد سے زیادہ واقف تھے۔

مدینے میں میثاق

یہ ساری صورتِ حال نبوی بصیرت پر روشن تھی اور اس صورت حال سے معاہدوں کے ذریعے عہدہ برآ ہوا گیا۔ سب سے پہلے مسلمانوں کے درمیان مواخاۃ قائم کی گئی اور اسے ایک میثاق کی شکل دی گئی۔

مسلمانوں کے درمیان اس میثاق میں یہ بات واضح کی گئی کہ مسلمان، سارے انسانوں سے مختلف ایک امت ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان میثاق کی دوسری دفعات یہ تھیں کہ سارے مسلمان اس شخص یا جماعت کے خلاف متحد ہوں گے جو مسلمانوں کے درمیان ظلم، فساد اور گناہ کو رواج دینے میں کوشش کرے گی اور مسلمان کسی ذاتی رشتے کو ایسے فرد یا جماعت کے خلاف کاروائی کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیں گے۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے خلاف کسی کافر کا ساتھ نہیں دے گا، عام مسلمان بھی اگر کسی سے کوئی عہد کرے گا تو اس عہد کی پاسداری ہر مسلمان پر لازم ہوگی، جو یہود مسلمانوں کی بالادستی قبول کر لیں گے ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کیا جائے گا اور ان کے خلاف کسی سے تعاون نہیں کیا جائے گا۔

معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے متعلق مسلمانوں کے باہمی میثاق نے ایمان کو معاشرے کا دستور بنا دیا کیونکہ ہر دفعہ اسلام کی اقدار کے مطابق تھی۔ مسلمانوں کے باہمی میثاق کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے یہود مدینہ کے ساتھ بھی ایک میثاق مرتب فرمایا، اس میثاق کا یہ پہلو تو بہت واضح اور سامنے کا ہے کہ یہود نے اسلام اور مسلمانوں کی بالادستی کے سامنے چار و ناچار اپنا سر جھکا دیا، لیکن ہم اس میثاق کے اخلاقی پہلوؤں میں نبی کریم ﷺ کے اخلاقِ کاملہ کی جامعیت اور پوری انسانی زندگی میں ہمدردی اور سلامتی پیدا کرنے کی قوت کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں اور یہ حیرانی چودہ صدیاں گزرنے کے بعد نئی معنویت کے ساتھ تاریخ کا ایک جلی اور عظیم عنوان بن گئی۔ اخلاقِ نبی ﷺ ہمارے لئے کامل اسوہ اسی لئے ہے کہ اس میں حیاتِ انسانی کا ہر گوشہ اور پہلو سمٹ آیا ہے اور اس اخلاق کی عملیت اور ہمہ گیری کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مہاجرین اور انصار کی سب سے بڑی دولت اور سرمایہ اسلام تھا، لیکن مدینے میں ان دونوں کی صورت حال (Situation) مختلف تھی اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ان دونوں کے درمیان ایسا معاہدہ، دونوں کی نفسیاتی ضرورت تھا۔ یہود کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لئے تحریری معاہدے کی ضرورت تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ معاہدہ مسلمانوں کی بالادستی اور غلبے کی دستاویز تھا جس پر یہود نے دستخط کر دیئے۔ ان پہلوؤں سے عظیم تر یہ پہلو ہے کہ یہ میثاق رسول اللہ ﷺ کے کردار میں صلح جوئی، امن پسندی اور بقائے باہمی کی خواہش کا اظہار ہے۔ یہود نے اپنی تاریخ اور اپنے مزاج کے مطابق بارہا اس میثاق کی خلاف ورزی کی اور انسانیت کو امن اور سلامتی کا پیغام دینے والا رسول ان خلاف ورزیوں اور معاہدہ شکنی کے باوجود کبھی ان کو سزا دینے کے معاملے میں حد سے آگے نہ بڑھا، یہاں تک کہ سورۃ توبہ میں ان کا معاملہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طے کر دیا گیا اور مرکز اسلام ان بدبختانِ ازلی سے خالی کرا

لیا گیا۔ عدل ہادی اعظم کے کردار کا بہت اہم اور نمایاں پہلو ہے۔ یہ کائنات بھی عدل اور حق کی بنیادوں پر قائم ہے اور یہ عدل قانون اور میثاق تک محدود نہیں بلکہ رسولِ اعظم ﷺ نے عدل کو ہر گھڑی پیش نظر رکھا اور اسی وجہ سے آپ کا کردار اور طرزِ عمل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میزان حیات بن گیا۔ یہود مدینہ کے علاوہ چند ہی برسوں کے بعد فتح مکہ کے موقع پر مشرکین مکہ کے ساتھ بھی وہ سلوک کیا گیا جو تاریخ انسانی میں امن کے قیام اور فساد کو روکنے کی انتہائی مثال ہے اور جس حد کوئی انسانی معاہدہ نہیں پہنچ سکا ہے اور کوئی انسانی فاتح اس عالی حوصلگی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکا ہے جس کی مثال محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش فرمائی اور جس کی ہدایت ہمیں ان الفاظ میں ملتی ہے:

وَ لَا یَجْرِ مَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ص وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ص وَ اتَّقُوْا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ O (۳۹)

جن لوگوں نے تمہیں مسجد حرام میں (داخلے سے) روکا تھا ان کی دشمنی (اور عناد) تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم (سزا دینے میں) حد سے گزر جاؤ، اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں مدد گار نہ بنو اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق نے انسانوں اور خاص طور پر میدانِ جنگ میں فتح پا لینے والوں کو یہ سبق دیا ہے کہ زمین پر فروتنی کے ساتھ چلنا اور بے علم اور جاہلوں سے اعراض برتنا اور پہلو تہی کرنا اللہ کے سچے بندوں کی پہچان ہے:

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۴۰)

رحمان کے حقیقی اور سچے بندے وہ ہی ہیں جو زمین پر فروتنی (اور عاجزی) کے ساتھ قدم رکھتے ہیں اور جب جاہل اور بے علم اُن سے الجھنے لگتے ہیں تو وہ کہتے ہیں (تم پر) سلام ہو (اور یوں فساد کی جڑ کاٹ دیتے ہیں)۔

یہود کے ساتھ جو معاہدہ ہوا اس کی نہج وہی تھی جو مسلمانوں کے باہمی معاہدے کی تھی، اس معاہدے کی اہم شقیں آنے والی سطور میں پیش کی جارہی ہیں:

۱۔ بنی عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک (سیاسی) قوم کی تشکیل کریں گے، دونوں اپنے

اپنے دین پر عمل کریں گے، بنوعوف کے علاوہ دوسرے یہودیوں کو بھی مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی، یہود کے متعلقین کو بھی یہی آزادی حاصل ہوگی۔

۲۔ اس معاہدے کے ایک فریق کے خلاف جنگ دوسرے فریق کے خلاف بھی جنگ سمجھی جائے گی اور دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

۳۔ مظلوم کی مدد کی جائے گی اور اُسے ظلم سے بچایا جائے گا۔

۴۔ اس معاہدے پر عمل درآمد کے سلسلے میں جو اخراجات ہوں گے یہود اپنے اخراجات کے ذمے دار ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات کے۔

۵۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی، ایک دوسرے کے بہبود کی نگہ داری فریقین کا فرض ہوگا (اس دفعہ سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ کسی معاہدے پر عمل خیر خواہی کے جذبے کے بغیر نہیں ہوسکتا، معاہدے کے الفاظ سے زیادہ اس کی روح اہم تر ہے۔ عہد حاضر کی ابلیسی سیاست اور سفارت کاری اس عنصر سے تہی دامن ہے، اسی لئے معاہدات پر ''قائم'' رہتے ہوئے ان سے گریز ہمارے عہد کا خاصہ ہے۔ اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی سیاسی حکمتِ عملی سیاست دانوں اور سفارت کاروں کے پیش نظر ہوتی تو سیاست حسنات میں داخل ہوتی اور دنیا میں امن کے حصول کا وسیلہ ہوتی)۔

۶۔ اگر کسی کے خلاف جنگ کی نوبت آئی تو دونوں فریق (یہود اور مسلمان) اخراجاتِ جنگ برداشت کریں گے۔

۷۔ قریش اور اُن کے حامیوں کے ساتھ کوئی ایسا تعلق نہیں رکھا جائے گا جس سے مدینے کی سلامتی خطرے میں پڑے اور قریش کے مددگاروں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا جائے گا۔

۸۔ یہ معاہدہ کسی ظالم اور مجرم کے لئے ظلم اور جرم کا جواز مہیا نہیں کرے گا۔ (۴۱)

اس معاہدے کی اہم ترین شق یہ تھی کہ کسی جھگڑے، اختلاف اور کسی نئے مسئلے کے پیدا ہونے کی صورت میں فیصلہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی روشنی میں محمد ﷺ کریں گے۔ معاہدے کی اس شق نے عملی طور پر سرورِ کائنات ﷺ کو مدینے کی ریاست کا مسلم سربراہ بنا دیا۔

یہ معاہدہ حضور اکرم ﷺ کے اخلاقِ عالیہ کا پرتو ہے۔ دونوں فریقوں کے حقوق کی پوری حفاظت، ریاست میں یہود اور مسلمانوں کی حیثیت میں برابری اور اجتماعی زندگی میں اخلاقی اقدار کی پاس داری، کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ کسی ظالم کا ساتھ نہیں دیا جائے گا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مسلمانوں کے اجتماعی اخلاق کو قوت ملی اور آپ نے معاشرے کو توازن، انصاف اور اعتدال کی خصوصیات عطا فرمائیں اور انسانیت سے آپ ﷺ کی خیر خواہی کا یہ عالم کہ آپ نے مغضوب قوم یعنی یہود کو بار آفرینی اور اصلاح کا موقع عطا فرمایا۔

مدینہ میں اسلامی معاشرے کا قیام

ریاست معاشرے کی منظم ترین صورت اور ادارے کا نام ہے، ہر ریاست کے خصائص اس کے شہریوں کے مزاج، اجتماعی اخلاق اور ضروریات کے مطابق ہوتے ہیں۔ عہدِ حاضر کی ریاستوں پر ایک نظر ڈالئے، مغرب میں جمہوریت کا سکہ رواں ہے اور اس جمہوریت کے نام پر دوسرے ممالک پر لشکر کشی کی جاتی ہے کیونکہ یہ جمہوریت اخلاقی اقدار سے محروم ہے اور یہ دہرے معیار رکھتی ہے۔ برطانیہ عظمیٰ جب ایک عالمی اور نو آبادیاتی طاقت تھا تو انگلستان کے لوگوں کے لئے انصاف اور جمہوری قوانین تھے اور نو آبادیوں کے لئے تازیانے تھے، ہاں ان مظالم اور تازیانوں کو بھی ''قانون'' کا نام دیا جاتا تھا۔ فرانس جس نے مغرب کو پہلے پہل آزادی کا درس دیا اور امریکہ کو مجسمۂ آزادی کا تحفہ، اس نے الجزائر کے مظلوموں پر کون سا ستم نہیں کیا۔ دوسرے جمہوری ممالک کی کہانی بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ امریکہ جو جمہوریت کے نام پر خدائی فوج دار Police man of the World بن گیا ہے اس نے کس طرح ہوائی پر قبضہ کیا، کس طرح فلپائن کو اپنی ''کالونی'' بنایا، کس طرح کوریا اور ویت نام میں وحشت و بربریت کی تاریخ رقم کی، اور آج کس طرح افغانستان اور عراق کو عالمی قبرستان بنایا جا رہا ہے، یہ کہانی تو اس ''روشن'' دور کی کہانی ہے، آج کی جمہوریت کی تصویر اقبال کا یہ مصرع ہے:

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

اور یہ حقیقت اس شعر میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

اخلاقی اقدار کے بغیر انسان کا ہر ادارہ انسانیت کے لئے زہر ہلاہل ہے۔

محمد رسول اللہ کے ساتھ آپ کے جو صحابہ ہجرت کر کے یثرب کو مدینۂ رسول بنانے کے لئے گئے

تھے ان کے دل انسانوں کی خیر خواہی کے خزینے تھے۔ یہ وہ تھے جنہوں نے غلاموں کو اپنے سینوں سے لگایا اور انسان کی تکریم کو اس درجے پر پہنچا دیا جہاں معاشرتی طور پر کچلے ہوئے انسانوں کو عالی مرتبت انسانوں کے برابر یا ان سے زیادہ عزت حاصل ہوئی، کیونکہ ان کے ہاں عزت کا پیمانہ تقویٰ، کردار اور اخلاق تھا۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس میں امیر المؤمنین عمر فاروق، بلالِ حبشی کو سیدی کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور انصارِ مدینہ نے تو ساری دنیا کی دشمنی کی قیمت پر اپنے رسول کو حاصل کر لیا تھا۔

مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک میثاق منعقد کیا اور ان کے درمیان مؤاخاۃ قائم فرمائی اور اسی کے ساتھ ان کے اجتماعی ادارے قائم فرمائے، دین و دنیا کی ثنویت کا کوئی تصور اسلام میں نہیں تھا، اسی لئے مسجد ان کا مرکزی ادارہ بنی۔ نماز تو دین کا ستون تھی۔ مسجد نے نماز کو ان کی زندگی کا مرکزی ادارہ بنا دیا، یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس کی عبادات بھی ادارہ ہیں اور مقام عبادت بھی ادارہ ہیں۔ ادارے ہی کسی معاشرے کو استحکام عطا کرتے ہیں۔ آج مسلمان معاشروں کا المیہ ہے کہ ہمارا مقام عبادت یعنی مسجد ایک ادارہ نہیں رہی، جو لوگ ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مسائل اور حالات کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ اسی طرح بیشتر مساجد میں آج تعلیم و تعلم کا کوئی بندوبست نہیں۔

مکہ معظمہ میں جو لوگ اسلام لائے ان میں سے ہر ایک تقوے کی تجسیم تھا۔ تقویٰ اللہ کی محبت اور اس کی خشیت کا حاصل جمع ہے۔ تقوے کے مفہوم کو حضرت اُبی بن کعب نے ایک مثال کے ذریعے امیر المومنین حضرت عمر فاروق کے سامنے پیش کیا تھا: انہوں نے فرمایا تھا کہ امیر المؤمنین اگر آدمی ایک ناہموار اور بہت تنگ پگڈنڈی سے گزر رہا ہو جس کے دونوں طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہوں اور اس کے جسم پر بیش قیمت لباس ہو اور وہ اس راستے کو اس طرح طے کر لے کہ نہ جسم پر خراش آئے اور نہ کپڑے کہیں سے پھٹیں تو اس طرح راستے سے گزرنا تقویٰ ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس مثال کو بہت پسند فرمایا۔

زندگی ایک ایسی ہی پگڈنڈی ہے جس کے دونوں طرح ترغیبات کی جھاڑیاں ہیں، گناہ کی دعوتیں ہیں، اس کو ذات کی پاکیزگی اور قلب و نظر کی طہارت کے ساتھ صرف اللہ کی محبت اور خوف کی بنا پر ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرام حضور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کے ذریعے اس تقوے کو حاصل کر چکے تھے اور اب مدینہ منورہ میں ان کے سامنے یہ مرحلہ تھا کہ وہ ذاتی تقوے کو معاشرے کا مزاج اور اس کی شناخت بنا دیں۔ اس کے لئے اداروں کا قیام لازم تھا تاکہ یہ اجتماعی تقویٰ اسلامی ریاست کے دستور کی بنیاد بن سکے۔

اپنے مختصر قیام قبا کے دوران سرورِ کائنات ﷺ نے مسجد قباء کی تعمیر فرمائی۔ مسجد قبا مدینۂ منورہ سے تین میل پہلے اس آبادی میں تعمیر کی جو بلندی پر ہے اور عالیہ کہلاتی ہے۔ اس نام کو اشارۂ الٰہی سمجھئے۔ عالیہ میں نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت کلثوم بن الہدم رضی اللہ عنہ کے مکان پر قیام فرما کر اس مکان اور اس کے مالک کے نام کو ہماری تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ حضرت کلثوم کی سعادت اور خوش بختی یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ مسجدِ قباء کی تعمیر اسی زمین پر کی گئی جو حضرت کلثوم کی ملکیت تھی۔ اس مسجد کے عمّار اعظم رسول اللہ ﷺ تھے اور آپ کے مددگار اور مزدور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم تھے۔ تعمیر کے لئے اہلِ قبا نے آپ ﷺ کے فرمان پر پتھر اکٹھے کئے، آپ نے سمتِ قبلہ ایک لکیر کھینچی اور ایک پتھر رکھ کر مسجد کی تعمیر کا آغاز فرمایا۔ آپ کے حکم پر اس کے برابر دوسرا پتھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رکھا، تیسرا پتھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے، چوتھا پتھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور پانچواں پتھر خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے۔ بعد میں حضرت علیؓ خود تشریف لا کر مسجد قباء کی تعمیر میں شریک ہو گئے تھے۔ مسجدِ قباء کی تعمیر میں پہلے پانچ پتھروں کی ترتیب کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے ترتیب خلافت کا جیسے تعین فرما دیا اور مسجد اور ریاست کے رشتے کی وضاحت بھی فرما دی گئی۔

صحابۂ کرام مسجدِ قبا کی تعمیر کرتے جاتے، پتھروں کو ان کی جگہوں پر لگاتے جاتے، کھجور کے تنوں سے ستون قائم کرتے جاتے اور چٹائی اور کھجور کے پتوں سے چھت ڈالتے جاتے اور حضرت عبداللہ بن رواحہ کے اشعار کو مل کر دہراتے جاتے۔ یہ الفاظ فضاء میں نغمۂ جاوید کی طرح دائرے بنا رہے تھے۔

افلح من یالج المساجد

و یقرء القرآن قائما و قاعدا

و لا یبیت اللیل عنہ راقدا

اس نے فلاح پائی جس نے مسجد بنائی، جس نے بیٹھے ہوئے اور کھڑے رہ کر قرآن کی تلاوت کی، اور جس نے رات جاگ کر گزاری۔

عربی مصرعوں میں زمانہ مضارع کا استعمال کیا گیا ہے، حال اور مستقبل۔ ہم نے اردو میں صوتی آہنگ کو اجاگر کرنے کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ یہ مصرعے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلم معاشرے میں مسجد کی تعمیر کی اہمیت کو پیش کرتے رہیں گے۔ اور یہ حقیقت سامنے آتی رہے گی کہ مسجد کے معمار ہر حال میں قرآن کو اپنے ہونٹوں، دل اور عمل میں سجائے رکھتے ہیں اور ان کی راتیں احکامِ الٰہی کو یاد کرنے میں

گزر جاتی ہیں۔ تعمیر مسجد ان کی زندگی اور شب و روز کا ایک استعارہ ہے۔ اسی مسجد کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلَ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ط فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ط وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ O (۴۲)

البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقوے پر پہلے دن سے رکھی گئی ہے، اس بات کا حق رکھتی ہے کہ آپ اس میں (عبادت اور نماز کے لئے) کھڑے ہوں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو طہارت اور پاکی سے محبت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک اور طاہر لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

یہ قرآنی آیت مسجدِ قبا کے ساتھ ساتھ مسجدِ نبوی الشریف کا بھی معنوی طور پر احاطہ کر لیتی ہے اور ان کے لئے واحد (مسجد) کا استعمال مقصد کے اعتبار سے ان کے ایک ہونے پر دلالت کرتا ہے، جیسے قرآن مجید میں کتبِ سماوی کے لئے لفظ کتاب استعمال کیا گیا ہے۔

''مسجد تقویٰ'' کے ساتھ ''مسجد ضرار'' کا بھی ذکر ہے جس کی تعمیر کا مقصد ہی مسلمانوں میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا تھا۔ بظاہر دونوں عمل یکساں تھے مگر مقصدِ تعمیر نے ایک کو ڈھائے جانے کا مستحق بنایا اور دوسری مسجد (مسجد تقویٰ) مقصود و مطلوبِ مومن قرار پائی۔ مسجد کی مثال سے ہمیشہ کے لئے یہ بات روشن اور واضح ہوگئی کہ اسلامی ریاست مسلمان معاشرے کو پاکی اور تقویٰ عنایت کرے گی اور اگر کوئی اسلامی ریاست کو نعرے اور سیاست کی بنیاد بنائے گا تو کامیابی اس سے دور رہے گی۔

میثاق بین المسلمین، میثاقِ مدینہ (یہود سے معاہدہ) اور مسجدِ قبا اور مسجد النبوی الشریف کی تعمیر مدینہ کی اسلامی ریاست کے سنگِ بنیاد ہیں۔

مدینہ منورہ کا اسلامی معاشرہ

اسلامی ریاست کے قیام اور مدنی زندگی کی اولین سرگرمیوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست کی بنیاد نبی اکرم ﷺ نے ان نفوسِ قدسیہ کے ساتھ مل کر رکھی جو اسلامی اخلاق اور صفات کے مالک تھے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اپنی محبت کے ثبوت دے چکے تھے۔ صحابۂ کرام استقلال، صبر اور پاکیزگیٔ قلب و نظر کے پیکر تھے۔ ایسے افراد کے بغیر اسلامی ریاست وجود میں نہیں آسکتی تھی اور دوسری طرف اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ اسلامی ریاست نئے مسلمان ہونے والوں کے لئے ایک مثالی

معاشرہ تعمیر کرتی ہے۔ ایک طرف افراد کے ذریعے معاشرے کے خدوخال متعین ہو کر سامنے آتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی معاشرہ اسلام کو اپنانے والوں کی راہوں کو سہل بناتا ہے۔

مدینہ منورہ کا اسلامی معاشرہ رسول اللہ ﷺ نے قرآنی بنیادوں اور اپنے اخلاقِ عالیہ کی اساس پر تشکیل فرمایا۔ اس معاشرے کے مختلف پہلو مسجدوں، بازاروں اور گھروں میں کس طرح نظر آتے ہیں، اس کو ہم انشاء اللہ مناسب مقام پر بیان کریں گے، لیکن اس کی بنیادوں، عناصر اور اجزائے ترکیبی کو مختصراً یہاں بیان کرنا مناسب ہوگا۔

کسی بھی معاشرے کی بنیاد تعاون پر رکھی جاتی ہے، صحت مند اور انسان ساز معاشرے میں خیر، عدل اور مساوات کے قیام کے لئے تعاون کیا جاتا ہے اور ناہموار معاشرے میں لوگ ظلم اور عدوان پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مدینہ میں وہ معاشرہ وجود میں آیا جس کے بارے میں ارشاد ہوا کہ یہ معاشرہ انسانیت اور انسانی اقدار کے فروغ کے لئے تشکیل پایا ہے اور یہ بات مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حوالے سے پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی نبوت صرف ایک نبی کی بعثت نہیں تھی بلکہ آپ کے ساتھ ایک امت بھی مبعوث فرمائی گئی تھی:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۴۳)

تم بہترین امت ہو جو انسانوں کے لئے وجود میں لائی گئی، کہ تم معروف اور اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو (اور بھلائی کی طرف دعوت دیتے ہو) اور منکرات (اور بری باتوں) سے روکتے ہو اور اللہ جل جلالہٗ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور خیر امم کے ہر طبقے نے اپنا کردار ایسے مثالی معاشرے کے قیام کے لئے ادا کیا۔ کسی بھی معاشرے میں افراد کے مراتب میں فرق ہوتا ہے لیکن معاشرے کی تعمیر میں ہر ایک کی ذمہ داری اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام نے اس سلسلے میں کسی مصنوعی اور غیر حقیقی مساوات کو اپنا آدرش اور نصیب العین قرار نہیں دیا، لیکن ہر فرد کے حقوق کی ضمانت دی اور اس باب میں کسی کو کسی دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ مدینہ منورہ کے معاشرے کے خدوخال کو ابھارنے میں ایک مسلمان غلام نے بھی جو حصہ لیا وہ بھی اتنا ہی اہم ہے جو ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کا حصہ ہے۔ ایک اخلاقی معاشرے کی یہ ایک بنیادی خصوصیت ہے:

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ

لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ط اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ص وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O (۴۴)

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا (اور اقتدار عطا کیا) اور ایک کا رُتبہ دوسرے سے بڑھایا تاکہ تم کو ان چیزوں میں آزمائے جو اس نے تمہیں دی ہیں۔ بے شک آپ کا رب جلد حساب لینے والا ہے اور بے شک وہ مغفرت کرنے والا رحیم ہے۔

اس آیت شریفہ کا مفہوم بہت وسیع ہے اور سیاق وسباق کے ساتھ اس کے معانی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلا مفہوم تو یہی ہے کہ انسان کو خلافتِ ارضی عطا کی گئی۔ دوسرے معانی یہ ہیں کہ اللہ نے تمہیں سلطنت عطا کی اور اختیارات عطا کر کے تمہاری آزمائش کی اور وہ اللہ ہی ہے جو مختلف حیثیتوں اور صلاحیتوں کے لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق آزماتا ہے اور اس سلسلے میں محاسبہ بھی کرتا ہے اور معاف بھی کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)

مراتب، صلاحیتوں، پیشوں اور ذمے داریوں کے اختلافات کے باوجود اسلامی معاشرے کے افراد سلسلۂ اخوت میں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کے حقوق کا یکساں احترام کیا جاتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ O (۴۵)

بے شک سارے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور اس سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

اس آیت میں ایک اصولی بات فرمائی گئی ہے انما المؤمنون اخوۃ۔ اس سے پہلے کی آیت میں مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان اختلاف اور جھگڑے کا ذکر اور اس بارے میں معاشرے کے طرزِ عمل کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان دونوں گروہوں میں عدل کے ساتھ صلح کرا دی جائے اور اگر زیادتی کرنے والی جماعت اپنے رویہ کی اصلاح نہ کرے تو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے یہاں تک کہ وہ ظلم اور زیادتی سے باز آ جائے۔ مدینۂ منورہ میں اسلامی معاشرے میں ایسے وقتی اختلافات پیدا ہوئے، لیکن چونکہ اس معاشرے میں قوت کے ساتھ ساتھ انصاف کی قدر، قوتِ نافذہ کا درجہ رکھتی تھی، اس لئے اختلافات اور جھگڑے حسن وخوبی کے ساتھ فیصل کرا دیئے جاتے تھے اور اخوت میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا تھا۔ اس معاشرے کے ہر فرد کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، اس لئے عدل کے ساتھ فریقین میں صلح کرا دی جاتی تھی۔ کیونکہ جماعتِ مومنین کو رب العالمین نے حکم دیا تھا:

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ O (۴۶)

پس ان کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور عدل کرو، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

جس معاشرے میں عدل ہوگا وہ ظلم سے پاک ہوگا خواہ وہ معاشرتی اور قانونی ظلم ہو یا اس ظلم کا عقائد کی دنیا سے تعلق ہو۔ قرآن حکیم نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔ ظلم ایک کثیر الجہاتی اور وسیع المفہوم لفظ ہے۔ کسی کی ملکیت، حدود اور اختیار میں ناجائز تصرف ظلم ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کو رب اور معبود قرار دینا اسی اعتبار سے ظلم ہے۔ جب آپ کسی کے حدود میں بے جا تصرف کریں گے تو کسی کی جگہ کسی اور کو دے دیں گے، اس طرح توازن بگڑ جائے گا اور یہ ہر ایک کے ساتھ ظلم ہوگا۔ ظلم کے معانی میں ظلمت کا پہلو بھی موجود ہے، کسی کی جگہ کسی کو دے دینا، اس سے بڑھ کر تاریکی اور کیا ہوگی جب عدل کی روشنی معدوم ہوتی ہے تو ظلم کی ظلمت اس خلا کو پر کرتی ہے۔ ظلم کی مختلف شکلیں پچھلی امتوں کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ عقیدے کے ظلم یعنی شرک کے علاوہ مترفین نے اہل ایمان کے لئے زندگی کو ہمیشہ مشکل بنایا اور ان کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا، آخر عذاب الٰہی نے ان بستیوں کو پکڑ لیا اور وہ نشانِ عبرت بن کر رہ گئیں:

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ج وَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ O (۴۷)

بہت سی ظلم کرنے والی بستیوں کو میں نے ڈھیل دی، پھر آخر انہیں (اس ظلم کی پاداش میں) پکڑ لیا اور میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

پوری انسانی تاریخ کے پس منظر میں مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست میں ہر نوعیت اور ہر سطح کے ظلم کی بیخ کنی کی گئی اور عدل معاشرے کے اجتماعی خیر کا حصہ بن گیا۔ اس حد تک کہ آج کی روشن اور عدل کی مدعی دنیا میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب ایک یہودی نے قرض کی کھجوروں کی ادائی کے سلسلے میں ریاست کے سربراہ اور اللہ کے عظیم ترین رسول کے ساتھ گستاخی کے ساتھ بات کی تو صحابۂ کرام کو شدید غصہ آیا لیکن نبیِ برحق ﷺ نے نہایت نرمی کے ساتھ اپنے اصحاب سے فرمایا کہ یہودی حق پر ہے اور تمہیں اس سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔

مدینے کے معاشرے میں ہر نوع کی تجارت ہو رہی تھی، کاشت کاری میں بھی لوگ مصروف تھے، دوسرے پیشہ ور بھی روٹی کما رہے تھے، ریاست بازاروں کے نظم و نسق کی درستی کے لئے اپنا کردار ادا کر

رہی تھی (یہ تفاصیل آگے چل کر پیش کی جائیں گی، اس وقت گفتگو مدنی معاشرے کے اخلاقی پہلو اور اس کے اجزائے ترکیبی کی ہو رہی ہے)۔ تمام اقتصادی سرگرمیوں کے باوجود اہلِ مدینہ کو پیٹ بھر کر روٹی فتح خیبر کے بعد مل سکی۔ ان حالات میں مدینے کے معاشرے میں ایک دوسرے کی خیر خواہی اور ایثار کے جذبے ہی سے اتحار اور معاشرتی ہم آہنگی قائم رہی۔ انصار و مہاجرین کے باہمی تعلقات اور ان کی اخوت بھی اسی خیر خواہی اور ایثار کی بنیادوں پر قائم تھی۔ ایثار کے اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ بعض مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے مہاجروں کو غنیمت میں زیادہ حصہ دیا لیکن انصار نے اس پر دل میں تنگی اور گھٹن اور حسد محسوس نہیں کیا۔ غزوہ حنین کے بعد غنیمت کی تقسیم کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں اس صورت حال کو اس طرح پیش کیا گیا ہے:

وَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَ لَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O (۴۸)

اور ان کے لئے جنہوں نے اس گھر (مدینہ) میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی ہے اور ان سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے ان کی طرف ہجرت کی اور جو کچھ ان مہاجروں کو دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں خواہ ان کو خود ہی کتنی سخت حاجت ہو۔ جس نے اپنے نفس کو بخل سے بچالیا وہ ہی فلاح پانے والوں میں سے ہے۔

یہ ہیں وہ اقدار اور اصول جن پر مدینہ کے مسلم معاشرے کی بنیاد رکھی گئی۔ معاشرے کے اس تشکیلی دور میں مسلمانوں کو یہود کی سازشوں سے بھی واسطہ پڑا اور قریش مکہ نے اسلام کے خلاف حالتِ جنگ کو برقرار رکھا۔ وہ مدینہ کے یہودیوں سے مسلسل رابطے میں رہے کہ کس طرح مسلمانوں میں انتشار پھیلایا جائے اور کس طرح مسلمان مدینۃ النبی سے نکالے جا سکیں۔

انسانی زندگی کی غیر معمولی صورت حال۔ جنگ

اس وقت تک یہ جنگ یک طرفہ تھی، یعنی قریش نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر حربہ استعمال کر لیا۔ مکہ معظمہ میں اسلام افراد کے دلوں میں گھر کر رہا تھا اور ان مسلموں کو عقائد اور اسلوبِ حیات کی

تعلیم دی جارہی تھی۔ یہ صبر، استقلال اور ثابت قدمی سے کفر کے ہر حملے کا جواب دے رہے تھے اور ویسے بھی وہ جس دین کے راستے پر سفر کر رہے تھے اس نے فساد کو قتل سے زیادہ سخت قرار دیا تھا۔ اسلام حیاتِ انسانی میں ہمہ جہتی ہمدردی اور سکون و امن کی طرف دعوت دے رہا تھا۔ اسلام امن کا راستہ ہے اور اس کا ثبوت یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہجرت کے بعد یہودیوں اور مدینہ کے گرد و نواح کے دوسرے قبائل کے ساتھ امن اور بقائے باہمی کے معاہدے کئے، لیکن کفر و شرک کی سازشیں جاری رہیں، اور آخر مسلمانوں کو کافروں کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی اور یوں جہاد ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ۔ جہاد تو پہلے ہی دن سے آئین اسلام میں داخل تھا۔ مسلمانوں نے اپنے دین کی خاطر ہر امکانی جدوجہد ہر مرحلے میں کی۔ قتال کا پہلا حکم ہمیں سورۃ الحج کی آیات ۳۹ اور ۴۰ میں ملتا ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ O الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ O (۴۹)

ان کو جن سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں اور جن پر ظلم کیا جا رہا ہے، مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے، بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے۔ یہ وہ (مظلوم) ہیں جن کو ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا، صرف اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت گاہیں، گرجے، یہودیوں کے معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ڈھا دی جاتیں۔ جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا اور اللہ بڑی قوتوں والا اور بڑے غلبے والا ہے۔

اس فرمان اجازتِ قتال میں اس اجازت کے اسباب اور حدود بھی بیان فرما دی گئی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے اخلاق اور دین کے قیام کے لئے آپ کی پامردی اور استقلال نے انسانی زندگی کی اس خلافِ معمول سرگرمی کو جسے جنگ کہا جاتا ہے، اخلاقی ضابطے، حدود و قیود اور مقصد عطا کر دیا ہے۔ جنگ ظالموں کی سرکوبی اور مظلوموں کی مظلومیت کو ختم کرنے کا وسیلہ قرار دی گئی ہے اور جنگ کا مقصد اور واحد مقصد اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ زمین گیری اور اپنی ''شہنشاہیت'' کے قیام کے لئے جنگ حرام ہے اور ایسی جنگ کا

نبی اکرم ﷺ کے دین میں کوئی تصور نہیں۔

گرجوں، عبادت گاہوں اور یہودیوں کے معابد کا ذکر کتنا برمحل ہے اور کس طرح جنگ کے حدود کا تعین کرتا ہے۔ اللہ کی عبادت کے طریقوں اور مختلف ادیان کے ماننے والوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت بھی اس اذنِ قرآنی کا جزو ہے۔

اسلام کا جہاد اور قتال فی سبیل اللہ انسانیت کے لئے کیسی برکت ہے، اس کا انداز ان جنگوں سے ہو سکتا ہے جو آج قیامِ جمہوریت کے نام پر مغربی سامراج نے مسلمان ملکوں اور تیسری دنیا کے ممالک پر مسلط کر رکھی ہیں، اور سیاست، تاویل کے ہزار پردوں کے باوجود یہ حقیقت آج کے ہر باشعور آدمی پر بے نقاب ہے کہ آزادی، جمہوریت کے نعروں کے پیچھے ان ظالموں کے اصل مقاصد چھپے ہوئے ہیں اور یہ مقاصد ہیں ان ملکوں کے تیل، معدنیات اور قدرتی ذخائر پر قبضہ۔ پھر یہ بے غیرتی تو دیکھئے کہ اپنے لئے دوسرے اخلاقی معیار ہیں اور مخالفوں کے لئے دوسرے۔ اپنے جوہری اسلحہ خانے میں اضافہ ان کا حق ہے اور دوسرے جوہری توانائی کے حصول سے محروم رکھے جائیں گے۔

لمحۂ حاضر سے گزرتے ہوئے ماضی کا سفر کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ بیسویں صدی عیسوی کی جنگوں میں فاتح اقوام نے مغلوب ملکوں اور قوموں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ انسان نے انسان پر کیسے ظلم ڈھائے ہیں اور کس طرح اپنے بنائے ہوئے کنونشن اور معاہدوں کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ کس طرح محکوم قوموں کے حصے بخرے کئے ہیں اور ان کی زمین کو آپس میں تقسیم کیا ہے۔ ترکی اور جاپان کے ساتھ اتحادیوں نے کیسی بربریت روا رکھی۔ مغربی ممالک نے مفتوح قوموں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جس نے مستقبل کی نئی جنگوں کو جنم دیا۔ پہلی جنگ عظیم، دوسری عالمی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور اقوامِ غالب نے اپنے حاشیہ نشینوں اور پروردہ ملکوں کی زیادتیوں، انصافیوں اور کمزوروں پر مظالم کی پشت پناہی کی۔ جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں اس وقت اسرائیل نے جنوبی لبنان کی بستیوں کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا ہے اور التوائے جنگ (سیز فائر) کی مسلسل خلاف ورزیاں کر رہا ہے اور امریکہ ہر ظلم میں اس کی تائید کر کے برابر کا شریک بن گیا ہے۔ اقوام متحدہ کو امریکہ نے ہمیشہ اپنی پیش دست کنیز بنانے کی کوشش کی ہے اور اگر فرانس اور مغرب کے چند ملک قدرے غیر جانب داری کا مظاہرہ نہ کرتے تو التوائے جنگ کا بھی مرحلہ نہ آتا۔ کون سا اسلامی ملک ایسا ہے جو امریکی دھمکیوں کا ہدف نہیں ہے، کچھ مسلمان ملک امریکہ کے حاشیہ برداروں میں شامل ہو کر راست دھمکیوں سے محفوظ ہیں، لیکن انہیں بھی امریکی ''جمہوریت'' کے نام

پر سبق پڑھاتے رہے ہیں اور غیروں کو ان کی دوستی حاصل کرنے کے لئے اپنے ''حلیفوں'' پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستان کو تو ہر قسم کی جوہری آسانیاں فراہم کی جارہی ہیں اور پاکستان کو ایف۔۱۶ طیاروں کے حصول میں بھی اپنی شرطوں کا پابند بنایا جارہا ہے۔ آج کے اس منظر نامے سے جنگ کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ، اخلاق اور اسلام کے مؤقف کی اہمیت اور اُجاگر ہو جاتی ہے۔ اسلام جنگ کے دوران ثابت قدمی اور دشمن کو کچلنے کی تعلیم دیتا ہے اور اس لئے کہ ''جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے''۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں جارحانہ جنگ کا تصور نہیں ہے لیکن جب کفر آمادہ پیکار ہو تو:

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ لا فَاِمَّا مَنًّا م بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۵۰)

(اور) جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو ان کی گردنیں مار دو، یہاں تک کہ ان کو اچھی طرح کچل ڈالو اور خوب مضبوطی سے گرفتار کرلو (پھر تمہیں اختیار ہے) کہ چاہے احسان رکھ کر چھوڑ دو اور چاہے فدیہ لے کر، یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔

کفر کے خلاف جنگ کی شدت اس آیت میں کتنی نمایاں ہے، کفر جب بھی حق کے مقابل آئے تو اس کی طاقت کو کچل دینا ضروری ہے تاکہ اور جنگوں کی گنجائش نہ رہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں مسلمانوں کو پابند بنا دیا گیا کہ انہیں احسان رکھ کر یا زیادہ سے زیادہ معاوضہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ غزوات کے سلسلے میں ہماری گفتگو سے یہ نکتہ اُبھر کر سامنے آئے گا۔ ان شاء اللہ

ان بنیادی اور اصولی باتوں کے بعد ہم غزوات کے سلسلے پر نظر ڈالیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ جنگ کو اسلام نے کس طرح اخلاقی اور انسانی ہمدردی سے جوڑ دیا ہے۔ اسلامی غزوات اور جنگیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ

ہمارے دامنِ شمشیر سے مرہم نکلتا ہے
جہاں ہم آگ رکھ دیں چشمۂ زمزم اُبلتا ہے

غزوات۔ امن کا راستہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ (یثرب) ہجرت کے بعد کس طرح یہودیوں سے معاہدہ کیا مدینہ منورہ اور اس کے نواح میں یہودیوں کی بستیاں تھیں۔ میثاق کے باوجود یہود عہد شکنی میں

مصروف رہے اور ان کی اسلام دشمنی نے سازشوں کا ایک جال بچھانے میں مصروف کر دیا اور قریش مکہ سے ان کے مسلسل رابطوں کا مقصد مدینہ منورہ سے مسلمانوں کا اخراج تھا۔ دوسری طرف قریش مکہ مسلمانوں کو طواف وزیارتِ کعبہ کی ''اجازت'' دینے کے لئے تیار نہ تھے، حالانکہ انہیں حرم کا راستہ کسی پر روکنے کا حق نہیں تھا۔ عہد جاہلیت میں بھی کعبہ کا اس درجہ احترام تھا کہ حرام مہینوں میں امن وامان قائم رکھا جاتا۔

ہجرت کے ابتدائی زمانے میں مدینہ منورہ پر قریش کے حملے کے امکانات اتنے قوی تھے کہ رسول اللہ ﷺ خود راتوں کو مدینے کی حفاظت کے لئے جایا کرتے تھے اور صحابہ کی ٹولیاں شاہراہوں کا حفاظتی گشت لگایا کرتی تھیں۔ فراستِ نبوی نے وحی الٰہی کی روشنی میں قریش کی تجارتی شاہراہ پر چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مکہ معظمہ کے قریش لوٹ مار کے چھاپہ مار دستے مدینہ منورہ اور اس کے مضافات میں بھیج رہے تھے۔ یہ مسلمانوں کی قوت اور چوکسی کا امتحان لینے کی ایک صورت تھی اور کسی جنگ کے لئے بہانہ تلاش کرنے کی کوشش تھی۔ قریش کا ایسا ہی ایک چھاپہ مار دستہ مدینہ کے قریب ایک چراگاہ پر حملہ آور ہوا اور رسول اللہ ﷺ کے مویشی پکڑ کر لے گیا۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جوابی کارروائیوں نے قریش کو احساس دلایا کہ اب ہوا کا رخ بدل چکا ہے اور اب مسلمان ان کی تجارتی شہ رگ کو کاٹنے کی قوت رکھتے ہیں۔

ان حالات میں قریش نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی طاقت کے اور بڑھنے سے پہلے ایک فیصلہ کن جنگ لڑی جائے، اس لئے انہوں نے ایک منتخب اور آزمودہ لشکر تیار کر کے مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کے رب نے کفار کے ارادوں اور ان کی عسکری تیاریوں سے باخبر کیا۔ یہ سب تفاصیل آپ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''حیاتِ محمد ﷺ قرآن حکیم کے آئینے میں'' میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ان سب تفاصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم غزوۂ بدر کے اخلاقی پہلو اور مسلمانوں کی تربیت پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں گے۔ غزوۂ بدر سے انداز ہوتا ہے کہ رسولِ اعظم ﷺ نے کس طرح اپنے اصحاب کو شوریٰ بینھم کی تربیت دی۔ حضور ﷺ مسلم معاشرے کے دونوں عناصرِ ترکیبی کی رائے کو برابر کی اہمیت دیتے ہیں۔ اس سے یہ اصول ہمارے سامنے آتا ہے کہ مشورے میں معاشرے کے ہر طبقے اور ذیلی گروہ کو اہمیت دی جائے یوں ہی معاشرے میں استحکام پیدا ہو سکتا ہے۔ مہاجرین نے کہا کہ ''ہم ہر صورت میں آپ کے ساتھ ہیں'' اور انصار کی ترجمانی کرتے ہوئے حضرت سعد بن معاذ نے کہا کہ ''ہم آپ کے ساتھ سمندر میں کودنے کے لئے بھی تیار ہیں''۔

غزوۂ بدر سے یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ موقف کی صداقت ہی اصل قوت ہے اور اس قوت کی

اساس اپنے رب پر کامل اعتماد اور یقین ہے۔ بیسویں صدی کے عظیم مؤرخ ٹوئین بی کے خیال کے مطابق رسول اللہ ﷺ اور اسلام کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ موت کا کانٹا قلبِ انسانی سے نکال دیا۔ سرورِ کائنات کے نظامِ اخلاق کے بنیادی نکات میں سے ایک نکتہ حیاتِ بعد الممات کا عقیدہ ہے۔ اسی عقیدے نے شہادت کو مقصود و مطلوب مومن بنا دیا ہے اور بزدلی جیسے اخلاقی عیب کو مسلمان کی زندگی سے نکال دیا ہے اور غزواتِ نبوی اس کی شہادت ہیں۔

بدر میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا کہ پانی کے کنوئیں ان کے قبضے میں تھے۔ کفار کے لئے پینے کے پانی کا حصول بھی مشکل تھا۔ قریش مکہ کے کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کے اس حوض پر آئے جہاں کنوئیں کا پانی ذخیرہ کیا گیا تھا۔ صحابہ کرام نے قریش کو پانی پینے سے روکنا چاہا مگر اخلاقِ انسانی کے معلم اعظم ﷺ نے فرمایا کہ ان پر پانی نہ روکو اور پینے دو۔ یہ حکم، جنگ کی اخلاقیات کا ایک عظیم درس ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ حوض سے پانی پیا وہ سب کے سب حکیم بن حزام کے سوا غزوۂ بدر میں مارے گئے۔ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بعد میں دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے۔ انہیں جب کبھی قسم کھانے کی ضرورت پڑتی تو یوں قسم کھاتے ''اس رب کی قسم! جس نے مجھے غزوۂ بدر میں قتل ہونے سے بچایا''۔

غزوۂ بدر میں قریش کے ستر آدمی مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے۔ یہ سب اسیرانِ جنگ مدینہ لائے گئے، مدینۂ منورہ میں کوئی قید خانہ نہیں تھا اور نہ قیدیوں کے رکھے جانے کا کوئی انتظام تھا۔ ان قیدیوں کو صحابۂ کرام کے درمیان تقسیم کر دیا گیا کہ وہ ان کی میزبانی اُس وقت تک کریں جب تک ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔

رسول اللہ ﷺ نے قیدیوں کے بارے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشاورت کی۔ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلیل، ہم مزاج اور مزاج شناس حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ یہ آپ ﷺ کے قرابت دار ہیں، انہیں معاف فرما دیجئے، شاید آپ کا سلوک ان کے دلوں کو اسلام کی طرف پھیر دے۔ اللہ کی شمشیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ کا مشورہ تھا کہ لکڑی جمع کر کے آگ بھڑکائی جائے اور کفر زادوں کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو قبول فرمایا۔ اس معاملہ میں وحی الٰہی نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ط تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ

الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۵۱)

نبی کے لئے سزاوار نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی ہوں جب تک کہ ملک میں اچھی طرح جنگ نہ ہو جائے (اور ملک غلبہ حاصل نہ کر لے)، (مسلمانو!) تم تو دنیا کا مال ومتاع چاہتے ہو اور اللہ تمہیں آخرت کا اجر عطا کرنا چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر (اس بارے میں) پہلے سے اللہ کا حکم نہ ہو گیا ہوتا تو تم نے جو (غزوہ بدر میں) مالِ غنیمت حاصل کیا ہے تو اس کے بارے میں ضرور تمہیں بڑا عذاب ہوتا۔

یوں وحی الٰہی نے یہ نکتہ واضح کر دیا کہ مالِ غنیمت سے اہم تر یہ بات ہے کہ جنگ کو فیصلہ کن بنایا جائے اور کفر کی وہ قوت توڑ دی جائے جو جنگ کا سبب بنتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں کے فیصلے کو کتاب من اللہ قرار دے کر انہیں اپنے عفو کا مستحق بنا دیا اور غنیمت کو ان کے لئے حلال وطیب قرار دیا:

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۵۲)

بہر حال جو مالِ غنیمت تمہیں حاصل ہوا ہے اُسے حلال وطیب سمجھ کر اپنے کام میں لاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ غفور ورحیم ہے۔

رسول اللہ ﷺ مکارم اخلاق کی تعلیم دینے کے لئے مبعوث نہیں فرمائے گئے تھے بلکہ آپ مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے تشریف لائے تھے۔ آپ نے ہر اخلاقی وصف کو بدرجۂ کمال عملی طور پر پیش کیا، فدیہ کے سلسلے میں بھی آپ نے قیدیوں کے حالات کو پیش نظر رکھا۔ فدیہ کی کوئی رقم قیدیوں پر جابرانہ طور پر نہیں تھوپی گئی بلکہ ان کے مالی حالات کے مطابق اس کا تعین کیا گیا۔ اگر کسی سے تین چار ہزار درہم لئے گئے تو کسی سے صرف ایک ہزار درہم، اور وہ قیدی جو کچھ ادا نہیں کر سکتے تھے ان کا فدیہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا، مقرر کیا گیا۔ اور جن کے پاس نہ تو درہم تھے اور نہ تعلیم ان کو احسان کرتے ہوئے رہا کر دیا گیا۔ ابوعزہ کی لڑکیوں کے مفلس باپ کو کسی فدیے کے بغیر اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ آئندہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف کسی کا ساتھ نہیں دے گا۔ اس نے اس شرط کی خلاف ورزی کی اور کسی معرکے میں پھر گرفتار ہوا تو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت زبیر نے اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔

ان قیدیوں میں نبیِ اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس، اور آپ کے داماد، حضرت زینب کے شوہر

ابوالعاص بن ربیع بھی شامل تھے۔ حضرت عباس کی مشکیں بہت مضبوط باندھی گئی تھیں جس سے وہ سخت اذیت میں تھے اور ان کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ ان کی کراہ سن کر رحمت عالم بے تاب ہو گئے، آپ ﷺ کی بے تابی دیکھ کر انصار نے رسی کی گرہیں نرم کر دیں اور رسولِ رحمت ﷺ سے کہا کہ ہم ان کا فدیہ معاف کرتے ہیں۔ چچا کی محبت کے باوجود رسولِ عادل اس بات پر رضامند نہ ہوئے اور کہا کہ ان کے فدیے سے ایک درہم بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ رحم اور عدل کا ایسا امتزاج رسول اللہ ﷺ کے سوا کس کے کردار میں مل سکتا ہے اور اس درجہ۔ خاندانِ رسالت کے اسیروں اور دوسرے قیدیوں میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔

نبی اکرم ﷺ کے عدل اور انصاف کے سلسلے میں کسی رشتے کی پرواہ نہ کرنے کا آپ کی شفقت اور نرم جذبات سے عجب ربط تھا، انسانوں کی محبت اور ان کا احترام آپ کے وجود میں اسی طرح رچا بسا تھا:

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نام

ابوالعاص کے فدیے کے طور پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے وہ ہار بھیجا جو ان کی ماں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی یادگار تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر محمد رسول اللہ ﷺ کے ذہن میں ماضی کی کتنی ہی وہ یادیں زندہ ہو گئیں جن کا تعلق پہلی مومنہ اور اس رفیقہ نبوت سے تھا جس سے کم و بیش ۲۷ سال تک کاشانۂ مصطفوی روشن رہا۔ آپ نے مسلمانوں سے اس ہار کو واپس بھیجنے کی درخواست کی۔ رسول اللہ ﷺ کا ہر لفظ مسلمانوں کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ ایسا حکم جس سے ان کی دنیا اور آخرت کے سنورنے کا رشتہ تھا، لیکن آپ نے مشورت کے دامن کو اس درجہ پھیلا کر ہر دور کے مسلمان حاکموں اور سربراہانِ مملکت کے لئے روشن نظیر قائم فرما دی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ابوالعاص کو یوں ہی رہائی نہیں دی گئی۔ بلکہ ایک شرط عائد کی گئی اور وہ یہ تھی کہ وہ مکۂ معظمہ واپسی کے بعد حضرت زینب کو مدینۂ منورہ آنے کی اجازت دیں گے۔ ابو العاص کو اپنی شریک حیات سے گہری محبت تھی اور انہوں نے اس رشتے کو بڑی محبت اور شرافت کے ساتھ نبھایا تھا، انہوں نے یہ شرط منظور کر لی۔ ابوالعاص جب مکہ معظمہ کے لئے روانہ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے پیچھے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرے انصاری کو بھیجا۔ ابوالعاص نے حضرت زینب کو مکے کے باہر ایک مقررشدہ جگہ پر پہنچا دیا اور حضرت زینب اپنے والدِ ماجد کی خدمت میں پہنچ گئیں۔

فدیے میں مالِ دنیا کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم کو شامل کرنا اس رسول کی فراست سے ہی ممکن تھا، جس تک آنے والی پہلی وحی اقرا باسم ربک الذی خلق تھی۔ اس سے یہ نکتہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ جنگ کی غیر معمولی صورتِ حال میں بھی مسلم معاشرے کی تشکیل اور صحیح خطوط پر اسے استوار کرنے کا

کام جاری رہا۔ یہ ہمہ گیریت کارنامۂ نبوت ہے۔ دنیا کے مفکر، مصلح اور رہنما کسی ایک یا چند باتوں کو اساسی اہمیت دیتے ہیں اور معاشرے کی تشکیل کی ہر جہت ان کی نظر میں نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کی ربانی بصیرت ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی۔ ان کے رب نے تو انہیں دنیا کو اپنے اسوہ اور اخلاق سے ان خطوط پر متشکل کرنے کے لئے بھیجا تھا جو تا قیامِ قیامت انسانیت کی رہنمائی کر سکیں۔

جیسا کہ سطورِ گزشتہ میں تحریر کیا گیا کہ ان قیدیوں کو مسلمانوں کے گھروں میں رکھا گیا، ان کی حیثیت جنگی قیدیوں کی بجائے مہمان کی سی تھی۔ اس وقت مدینۂ منورہ کے معاشرے میں عام مسلمانوں کو معاشی فارغ البالی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ان کے گھروں میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ کھجوروں پر عموماً گزر بسر ہوتی اور یہ کھجور بھی باافراط نصیب نہیں ہوتے تھے۔ اصحابِ صفہ کے احوال میں ہمیں ان کے فقر و فاقہ کی تفصیلات ملتی ہیں۔ یہ حضرات جب کسی کھانے کی جستجو میں نبی اکرم ﷺ یا حضرت ابوبکر، حضرت عمر جیسے ساتھیوں سے رجوع کرتے تو معلوم ہوتا کہ ان کی حالت بھی اصحابِ صفہ سے مختلف نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ان جلیل القدر انسانوں نے اپنے آپ کے لئے فاقے کو اختیار کیا اور اپنے مہمانوں کے لئے حتی الامکان اچھے سے اچھے کھانے کا بندوبست کیا۔ یہ ایثار اور حسنِ سلوک دیکھ کر ان قیدیوں کے دلوں میں اسلام کے لئے گنجائش پیدا ہوئی، انہیں اسلام کی دولت حاصل ہوئی اور مکہ معظمہ واپسی کے بعد وہ مسلمانوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کرتے۔ (۵۳)

غزوۂ بنوقینقاع: بنوقینقاع یہودِ مدینہ کا ایک قبیلہ تھا، مدینہ کے گردونواح میں یہود کی تین بستیوں میں سے ایک بستی۔ یہ اپنی بہادری پر بڑے نازاں تھے۔ ان یہودیوں نے کبھی مسلمانوں کے ساتھ اپنے میثاق کی پاس داری نہیں کی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان پر اسلام کو پیش کیا اور میدانِ بدر میں قریش کے انجام سے سبق حاصل کرتے ہوئے انہیں اللہ سے ڈرنے کا پیغام دیا تو ان لوگوں نے بڑی رعونت سے جواب دیا کہ ہم قریش نہیں۔ ہم جنگ جو ہیں اور میدانِ جنگ میں اپنی تلواروں سے اپنی تقدیر لکھنا جانتے ہیں۔

ایسی گفتگو تک بات محدود نہیں رہی بلکہ یہ ایسی شرارتیں کرتے رہے جن سے مدینے کی فضا مکدر ہو جاتی اور امن کو امان کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ یہ مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست کے اختیار کے لئے ایک چیلنج تھا۔ ایک دن ایک مسلمان عورت بنوقینقاع کے ایک یہودی سنار کی دکان پر آئی اور اس نے شرارت سے اُسے بڑی حد تک بے لباس کر دیا۔ اس خاتون نے شور مچایا، اس پر سنار بے حیائی کے ساتھ ہنسنے لگا۔ ایک مسلمان جو اس علاقے سے گزر رہا تھا اس بات پر برداشت نہ کر سکا اور اس نے یہودی سنار کو قتل کر دیا،

اس پر یہودیوں نے یلغار کر کے مسلمان کو شہید کر دیا۔ یہ ایک بڑے فتنے کا نقطہ آغاز تھا اور بعد کے واقعات نے یہودی فساد کے دائرے کو بڑھا دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس فتنہ کو کچلنے کے لئے بنوقینقاع کا محاصرہ کر دیا، یہ محاصرہ وسطِ شوال سے ذی القعدہ کے آغاز تک جاری رہا۔ آخر یہودی مجبور ہو کر آپ ﷺ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ آئے کہ ان کی دولت اور مال و متاع کا ایک حصہ آپ لے لیں اور ان کی اور ان کی بال بچوں کی جان بخشی کی جائے۔ نبیٔ رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو سلامتی کے ساتھ جلاوطنی کا حکم دیا۔ جلاوطنی کے تمام مراحل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں طے ہوئے اور بنی قینقاع کے یہود شام کی طرف کوچ کر گئے۔ اللہ کی حکمت بالغہ یہودیوں کی میثاق شکنی کے نتیجے میں مدینے اور اس کے گرد و نواح کو یہودیوں سے پاک کر رہی تھی اور ان کے فتنہ و فساد کے نتیجے میں یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ اسلام سلامتی اور امن کا دین ہے، اور انسانی زندگی کی حرمت اسلام میں ایک بنیادی قدر کا درجہ رکھتی ہے۔ غزوۂ بنوقینقاع کا ایک ذیلی نفع یہ تھا کہ اہلِ ایمان کا ایمان روشن تر اور مستحکم تر ہو گیا اور منافقین کا نفاق اور زیادہ ابھر کر سامنے آ گیا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بنوقینقاع کے حلیف تھے، اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں وہ یہودیوں کی دوستی سے بیزار ہو گئے، اور انہوں نے اعلانِ برأت کر دیا، دوسری طرف اس واقعہ نے عبداللہ بن اُبی کی منافقت کو اسلامی معاشرے کے سامنے اور بھی نمایاں کر دیا۔ (۵۴) اس اور اس جیسے دوسرے واقعات کے ذریعہ صحابۂ کرام کی اخلاقی صفات معاشرے کے مزاج کا حصہ بنتی چلی گئیں۔ اللہ تعالیٰ کے قرآنی احکام نے اسلام لانے والوں (مسلم) کو مومن بنایا اور یوں ایمان ان کے قلوب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت اور تربیت اور آپ کے اسوۂ حسنہ نے ان مومنوں کو محسنین کے درجے تک پہنچا دیا۔ محسن وہ ہے جو معاشرے کو توازن کے حسن سے جگمگا دے، جو دوسروں کی کمیوں کو پورا کر دے۔ احسان، عدل کے بعد کی منزل ہے اور احسان اُسی معاشرے میں نظر آ سکتا ہے جس میں عدل عام ہو اور قانون کی سطح سے بلند تر ہو کر عام لوگوں کے مزاج میں رچ بس جائے۔

بنوقینقاع کی جلاوطنی کے پس منظر میں سورۃ المائدہ کی ان آیات کو سمجھا جا سکتا ہے جن میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ مسلمانوں کے طرزِ عمل کو متعین کیا گیا ہے۔ کفر سے دوستی رکھنے والوں کا شمار انہیں میں ہو گا، کیونکہ اس طرزِ عمل سے ان کے دلوں کی بیماری سامنے آ جاتی ہے۔ ان آیات میں آنے والے زمانے کے بارے میں بھی پیش گوئی کی گئی ہے جب مرتدین کے خلاف اللہ سے محبت رکھنے والوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جہاد کیا اور مسلمانوں کو ایک مضبوط تر جماعت کے طور پر اپنی شیرازہ

بندی کا موقع ملا۔ ان آیات میں یہود اور نصاریٰ کی اسلام دشمنی کے بنیادی سبب کو بھی پیش کر دیا۔ قرآن حکیم کی ان آیات میں مسلمانوں کے اخلاق کے بیان میں یہ اخلاقی وصف ہمارے سامنے آتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہیں، اہلِ ایمان کے لئے حریر و پرنیاں کی طرح نرم اور کفر کے لئے شدید ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، یہ اللہ اور رسول کی محبت اور ان کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے کسی کی ملامت اور طنز و تشنیع کی پرواہ نہیں رکھتے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ ۘ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ O فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْھِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَۃٌ ؕ فَعَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِہٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَآ اَسَرُّوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ نٰدِمِیْنَ O وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰہِ جَھْدَ اَیْمَانِھِمْ لا اِنَّھُمْ لَمَعَکُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِیْنَ O یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَ یُحِبُّوْنَہٗٓ لا اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ز یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ O اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ ھُمْ رٰکِعُوْنَ O وَ مَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ O یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَکُمْ ھُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَ الْکُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ O (۵۵)

اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں (ان کے مقاصد یکساں ہیں) تم میں سے جو بھی انہیں اپنا رفیق بنائے گا انہیں میں سے سمجھا جائے گا۔ اللہ ظالموں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ اے رسول آپ دیکھیں گے کہ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے انہیں کی طرف دوڑ رہے ہیں (اور انہیں میں گھس رہے ہیں) اور کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہمیں کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے (یعنی مسلمانوں کو شکست

ہو اور ہم بھی ان کے ساتھ دینے کی وجہ سے افتاد میں پڑ جائیں) یا ممکن ہے کہ اللہ انہیں فتح دے دے، یا اس کی طرف سے غلبے کی کوئی اور صورت ظاہر ہو جائے اور اس وقت وہ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو انہوں نے چھپا رکھی ہے۔ اور اس وقت ایمان والے کہیں گے کہ کیا یہی لوگ ہیں کہ اللہ کی سخت سے سخت قسم کھا کر کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ان کے اعمال اکارت گئے اور یہ خاسروں اور نامرادوں میں ہو گئے۔ اے ایمان والو! جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو (میدان میں) لائے گا جو اللہ کو محبوب ہوگی، اور جو اللہ سے محبت رکھتی ہوگی، یہ لوگ مسلمانوں کے لئے نرم دل ہوں گے اور کافروں کے لئے شدید ہوں گے، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جسے چاہے عطا کر دے اور اللہ بڑا صاحبِ وسعت ہے اور اس کا علم بہت وسیع ہے۔ اللہ اور اس کا رسول مسلمانوں کے دوست اور ولی ہیں اور وہ ایمان والے بھی ان کے دوست اور مددگار ہیں جو اقامتِ صلوٰۃ پر قائم ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ اور جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور مسلمانوں سے دوستی رکھے وہی لوگ اللہ کی جماعت (حزب اللہ) ہیں اور وہی غالب آ کر رہیں گے۔ اے ایمان والو! ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کو ہنسی کھیل اور باعثِ تمسخر سمجھتے ہیں خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا کافر۔ اگر تم مومن ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو۔

یہ آیات بہت روشن ہیں، اہلِ ایمان کی صفات کے باب میں اور کفر و ایمان کی جنگ میں فریقین کے طرزِ عمل کے بارے میں۔ مسلمان اسباب و وسائل میں بھی کم تھے اور انہیں عددی غلبہ اور کثرت بھی حاصل نہیں تھی، لیکن رب العزت اور غلبہ و نصرت کے مالک نے انہیں کفر کی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ نسخہ عطا کر دیا جس نے انہیں وہ طاقت عطا کر دی کہ کفر کی موجیں ان سے ٹکرا کر پسپا ہو گئیں اور وہ نسخہ تھا تقویٰ۔ تقویٰ ہی جہادِ زندگی میں مسلمان کی وہ شمشیر ہے جو فتح کی نوید ہے۔

غزوۂ اُحد، اس کے سبق

غزوۂ بدر کے ایک سال کے بعد غزوۂ اُحد برپا ہوا جس کے دامن میں ہمارے لئے کئی اخلاقی سبق

ہیں۔ زندگی کا کوئی معاملہ ہو، کوئی معرکہ ہو، کوئی واقعہ ہو اس کا اخلاقی پہلو ہمارے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ زندگی کا ہر پہلو ہمارے اخلاق کے کسی نہ کسی گوشے کو ابھار کر سامنے لاتا ہے اور ہر پہلو میں رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

غزوۂ اُحد کا سب سے اہم اخلاقی، دینی اور اجتماعی پیغام اطاعتِ رسول ﷺ کی اہمیت ہے۔ اسلام اللہ جل جلالہ اور اس کے احکام کی اطاعت کا نام ہے اور ان احکام کی اطاعت قرآنِ حکیم اور رسول اللہ کی سنت کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ اللہ کی محبت سرورِ کائنات ﷺ کی اتباع کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ رسولِ برحق ﷺ کی پیروی اور آپ کے احکام کے آگے سر جھکانے کا نام اسلام ہے۔ اطاعت کا مادہ ط و ع ہے، اس میں کسی کام کے برضاء ورغبت، کسی جبر کے بغیر اور دل و نظر کی کشادگی کے ساتھ انجام دینے کا مفہوم موجود ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ہم حکم دینے والے کے ساتھ وابستہ ہوں۔ اللہ ہمیں اس عالمِ امکان میں نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی کتاب اور اپنے رسول کے اسوۂ حسنہ کے آئینے میں اپنی جلوہ گری کرتا ہے، اسی لئے رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ دونوں کی اطاعت کا ذکر قرآن مجید میں ہمیں ایک ساتھ نظر آتا ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت مسلمان کو انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی رفاقت کی دولت عطا کرتی ہے اور اس سے بہتر رفاقت اور کون سی ہو سکتی ہے۔ اس رفاقت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس دنیا سے لے کر اگلی دنیا تک۔ ہر فلاح اور کامیابی اس اطاعت سے وابستہ ہے، حُبِ رسول کے خالی خولی اور کھوکھلے نعروں کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر اعتبار حاصل ہے تو ان کی سنت کی پیروی اور ان کی اطاعت کو۔ سلام ان ﷺ پر اور ان کی اطاعت کرنے والوں پر، صلی اللہ علیہ وسلم۔

غزوۂ اُحد میں نبیٔ اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ہمیں اخلاق کے کیا سبق ملتے ہیں اس کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم پہلے اطاعتِ رسول ﷺ کی اہمیت، نوعیت اور اس کی وسعت کا جائزہ قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں لیں۔

سورۃ النساء احکام کے بیان کے اعتبار سے سورۃ البقرہ کے بعد قرآن مجید کی نہایت مفصل اور محکم سورت ہے اس میں اطاعتِ رسول کے گوشوں کو طرح طرح سے رب العزت نے بیان فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے وصیت اور میراث کی تقسیم کے بارے میں ورثا کے حصوں کے تعین کے بعد فرمایا:

تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ ط وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا ط وَ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ O (۵۶)

یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ان جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ سب سے اہم اطاعت حدودِ شرعیہ کی ہے، ضمناً یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بعض حدود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے عطا کی ہیں اور ان کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں ہے بلکہ وہ آپ کی سنت سے قائم اور ابدی حیثیت رکھتی ہیں، جیسے زانی مرد وعورت کے لئے رجم کی سزا۔ پھر یہ بات بھی سامنے آئی کہ جنت کا حصول ان حدود کی پاسداری اور پاسبانی سے وابستہ ہے، جنت اس دنیا کی کھیتی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اسلامی قانون کی بنیادی شق ہے جس کا سلسلہ اسلامی حکومت کی اطاعت سے جاملتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝ (۵۷)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہیں (اربابِ حکومت) پھر اگر کسی بات میں اختلاف پیدا ہو تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ (تمہارے لئے) بہت بہتر ہے اور اعتبار کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔

اس آیت مبارکہ سے اسلامی قانون اور آئین کو تسلسل عطا ہوتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ ان الحکم الا للہ (۵۸) حکم تو صرف اللہ کا ہے لیکن اللہ کا حکم محمد ﷺ اس دنیا میں نافذ کرنے کے لئے تشریف لائے تھے اور اس طرح کہ حکم اخلاق بن جائے۔ یہی وہ صورت ہے کہ حکم مسلط نہیں کیا جاتا بلکہ اخلاق اور کردار بن کر روح کی گہرائیوں میں پھول کی طرح اگتا ہے، اور پھر خارجی ماحول اس کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔ یہ بات بھی اہل ایمان پر روشن ہوگی کہ آخری حکم، سند اور اختیار اللہ اور رسول کا ہے اور مسلم حکمرانوں اور ان کی رعایا میں اسی ''اتھارٹی'' کی بنیاد پر نہ ٹوٹنے والی ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے اور یوں ہی ایک ہمہ گیر اجتماعی اخلاق معاشرے کو امن وسکون کا گہوارہ بنا سکتا ہے، جب بھی مسلمان نے رسول کی اطاعت سے منہ موڑا جیسے غزوۂ

احد میں، انہیں پسپائی نصیب ہوئی کہ رسول کے حکم سے سرتابی، رب العزت سے انحراف اور بغاوت ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ط وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًاO (۵۹)

جو رسول (ﷺ) کی اطاعت کرے (کرتا ہے) اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو (اے رسول) ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔

اِس آیت کو مدینۂ منورہ کے معاشرتی حالات کے پس منظر سے سمجھا جا سکتا ہے، جب یہودی سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے اطاعت کا دم بھرتے تھے اور آپ کی محفل سے اٹھ کر ان کا دوسرا چہرہ طغیان اور تاریکی سے فضا کو آلودہ کرتا تھا اور ان کی راتیں حضور نبی کریم ﷺ، مسلمانوں اور اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو کر اندھیروں کو اور بڑھا دیتیں۔ ان کے نفوس کی ظلمت رات کو سیاہ تر بنا دیتی۔ اس آیت (۶۰) کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ آپ ان کی پرواہ نہ کریں

فاعرض عنهم و توكل على الله و كفى بالله وكيلا (۶۱)

ان سے منہ پھیر لیجئے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے کہ وہ ہی آپ کا وکیل اور کارساز ہے۔

غزوۂ احد اپنے نتائج اور ثمرات کی بنا پر غزوۂ بدر کی سی اہمیت رکھتا ہے اور اسی لئے جس طرح قرآن مجید میں سورہ الانفال میں بدر کا احوال پیش کیا گیا ہے اسی طرح سورہ آل عمران میں غزوۂ احد کے نتائج، اس کے اخلاقی اثرات اور مسلم معاشرے پر اس کے مرتب ہونے والے نتائج کی روداد اپنے دامن میں رکھتا ہے۔

اگرچہ یہود سے معاہدہ تھا کہ مدینے پر حملے کی صورت میں وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر شہر کا دفاع کریں گے لیکن غزوۂ احد کے موقع پر جب صحابۂ کرام نے سرورِ کائنات ﷺ سے عرض کیا کہ ہم اپنے حلیف یہودیوں کو بھی شریک جنگ کریں گے تو آپ ﷺ نے اپنی نبوی فراست کی بناء پر اس بات کو قبول نہیں کیا۔ دو دِلے رفیق زندگی کے ہر میدان میں نقصان دہ ہوتے ہیں اور میدانِ جنگ میں تو ان پر بالکل اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس سے اہم تر نکتہ یہ ہے کہ غزوۂ احد صرف شہر مدینہ کی حفاظت کے لئے نہیں تھا بلکہ اسلام کے تحفظ کے لئے تھا اس لئے نبی اکرم ﷺ اسلام کے دشمنوں کا احسان کیسے قبول کر سکتے تھے۔

اس معرکے سے مسلمانوں میں تنظیم کی کمی اور اپنے عقائد میں قدرے ناپختگی ابھر کر سامنے آ گئی۔ اس معرکے میں اسلامی لشکر میں ۷۰۰ سات سو افراد تھے اور دشمن کی فوج میں تین ہزار آزمودہ کار اور سر سے پیر تک لوہے میں غرق جنگجو سپاہی تھے، بدر کی فتح پر ابھی ایک سال ہی گزرا تھا لیکن مسلمانوں کے دو قبیلوں کے دل

دشمن کی تعداد کو دیکھ کر لرزاں تھے۔ کارزار کی صبح حضور ﷺ نے اسلامی فوج کو ترتیب دیتے ہوئے پچاس تیر اندازوں کو ایک درّے پر متعین فرمایا جو انتہائی جنگی اہمیت کا حامل تھا اور آپ ﷺ نے ان سے فرمادیا کہ کسی حالت میں یہاں سے نہ ہٹنا چاہے تم دیکھو کہ پرندے مسلمانوں کو اچکے لئے جا رہے ہیں۔ یہ اظہار محاورۂ عرب کے مطابق انتہائی سنگین حالات کی عکاسی کر رہا تھا، لیکن جب معرکۂ کارزار گرم ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہونے لگی تو تیر اندازوں کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیل رضی اللہ عنہ اور ایک دو ساتھیوں کے علاوہ سب نے بھاگتے ہوئے دشمن کے مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لئے درہ چھوڑ دیا۔ یہ عمل اولاً تو حکم رسول ﷺ کے خلاف تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مال و دولت، دنیا فتح سے عزیز تر تھی۔ اور اس میں یہ گمان بھی شامل تھا کہ خدانہ کرے بہ صورت دیگر انہیں مالِ غنیمت سے حصہ نہ ملے، یہ رسول امین ﷺ پر ایک انداز کی بے اعتمادی کا اظہار تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ جسے ہر مسلمان کا حق عزیز تھا جس کے عمل سے کسی کے لئے ادنیٰ ترین انصاف کی کمی کا اظہار نہ ہوا تھا اور جو مالِ غنیمت میں ملنے والے جوتے کے ایک فیتے کو بھی شمار میں رکھتا تھا اور رنگین دھاگے کی ادنیٰ ترین مقدار کا چھپانا بھی جس کے نزدیک دوزخ کا راستہ تھا۔ اس سے یہ بات سامنے آئی کہ مسلمانوں میں تنظیم کی کمی کے ساتھ ساتھ رسول ﷺ برحق پر یقین اور اعتماد پر لمحاتی کمزوری غالب آگئی تھی۔

جب مسلمانوں کے قدم میدان سے اکھڑ رہے تھے تو اس وقت ابوسفیان نے آواز لگائی کیا تم میں محمد (ﷺ) ہیں۔ حضور نے مسلمانوں سے فرمایا جواب نہ دو، پھر ابوسفیان کی آواز گونجی کیا تم میں ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہیں، حضور ﷺ کے اشارے پر مسلمان خاموش رہے، پھر ابوسفیان کی آواز گونجی کیا تم میں عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) ہیں، مسلمان مرضیٔ رسول ﷺ کے مطابق خاموش رہے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کے بعد شیخین ہی کفر کے سینے میں تیر کی طرح پیوست تھے۔ اس خاموشی کے بعد ابوسفیان نے نعرہ لگایا **اعلی ھبل** یعنی برتری ہوبل کے لئے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے کہا نعرہ بلند کرو **اللہ اعلی و اجل**۔ ابوسفیان نے اس کے جواب میں کہا ہمارے لئے عزیٰ ہے اور تم عزیٰ سے محروم ہو۔ سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ نے اس نعرے کے جواب میں یہ نعرہ لگانے کی ہدایت کی **اللہ مولانا و لا مولیٰ لکم** اللہ ہمارا کارساز ہے اور تمہارا کوئی مولا نہیں۔ (۶۲)

امہات المؤمنین کے حجرات ہوں یا مسجد نبوی کے ستون و منبر، مدینے کے باغات میں چہل قدمی ہو یا کوئی محفل یاراں، کوئی سائل آیا ہو یا حضور ﷺ کسی بازار سے گزر رہے ہوں یا اُحد کا وہ سخت دن ہو جب آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور خود کی کڑیاں آپ کے رخسار مبارک میں گڑ گئیں، کسی عالم اور کسی

حال میں آپ صحابۂ کرام کی اخلاقی تربیت سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہ ہوئے، آپ ﷺ کے علاوہ اور کون معلم اعظم کہلانے کا مستحق ہے؟ حضور ﷺ اخلاق کی تعلیم دینے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ اخلاق کریمانہ کی تکمیل کے لئے آئے تھے، حضور ﷺ کا ہر سانس درسِ اخلاق تھا، آپ کی ہر جنبش کتاب اخلاق تھی، آپ کا کلام اور آپ کا سکوت دبستان اخلاق تھا، اخلاق کی اس وسعت کو سمیٹنے کے لئے انسانوں کے بنائے ہوئے پیمانے اور معیار کام نہیں آسکتے۔ اخلاق محمدی ﷺ کو صرف قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے اخلاق کے معنی، مفاہیم اور امکانات سب کو بدل دیا اور اخلاق کے نئے آفاق آپ کے عمل، آپ کے کلام، آپ کے سکوت سے وجود میں آئے۔

سلام ان پر، درود ان پر، انسانیت تاقیامِ قیامت زندگی کے ہر شعبے کی طرح اخلاقیات کے باب میں رسولِ آخرالزمان ﷺ کے احسانات سے سر کبھی اٹھا سکتی۔

قرآن حکیم نے غزوۂ احد کا تذکرہ محض واقعات، فتح وشکست اور پھر فتح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں مسلمانوں کے کردار، وقتی خامی اور کمی کے ساتھ ساتھ نفوس کا تجزیہ بھی فرمایا ہے اور اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ فتح وظفر کا تعلق بھی اللہ کی اعانت اور نصرت سے ہے اور یہ کہ اہل ایمان کو صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا چاہئے:

وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ O (۶۳)

اور یہ اللہ کا حق ہے کہ مومن اس پر توکل کریں۔

اس اخلاقی سبق اور غزوۂ احد سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ صبر اور استقامت جہاد سے اہم تر ہے، سچ تو یہ ہے کہ جہاد صبر اور استقامت کی اعلیٰ ترین شکل ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ O وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ص فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ O (۶۴)

کیا تم نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ تم جنت میں یونہی داخل کیے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی ان لوگوں کو جانچا نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اس نے تم میں سے ثابت قدم رہنے والوں کی آزمائش نہیں کی اور تم تو موت سے دوچار ہونے سے پہلے موت کی تمنا کر رہے تھے اور اب تو تم نے موت کو دیکھ لیا۔

یہ اسلوب قرآن کس قدر فصیح اور انسانی نفسیات کے مطابق ہے۔ اللہ تو کائنات اور نفسِ انسانی کی ہر کیفیت سے باخبر ہے اور اس کا علم تو ماضی حال اور مستقبل پر محیط ہے، یہاں علم کا مفہوم جانچ ہے اور اس علم کا تعلق انسانی گروہ سے ہے یعنی اہل ایمان دیکھ لیں کہ کس نے جہاد کیا اور کون ثابت قدم رہا۔

جیسے کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے کہ اصل مسئلہ فتح ونصرت کا نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کی تربیت کا تھا تاکہ وہ اقوام عالم کی قیادت کے قابل بن سکیں اور یہ ہی ''تحویل قبلہ'' کا مقصود تھا، غزوہ احد کے ان اخلاقی پہلوؤں کو سید قطب شہید نے اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں نہایت شرح وسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

غزوۂ احزاب

غزوۂ احد کے بعد مشرکین مکہ اور خیبر کے یہود اور دوسرے مشرک قبائل کے درمیان روابط اور بڑھ گئے، یہودیوں کے نمائندوں نے مکۂ معظمہ جا کر مشرکین قریش کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے منصوبے تیار کرنے شروع کیے۔ کافروں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ انہیں ایک بڑا اتحاد قائم کرنا ہوگا تاکہ اسلام کی بیخ کنی کی جا سکے۔ یہود نے قبیلۂ غطفان کو خیبر کے آدھے محاصل کی پیش کش کی، عطفان والوں نے اپنے حلیف بنو اسد کو اس اتحاد میں شرکت کی دعوت دی۔ یوں مختلف قبائل جمع ہو کر مدینے پر لشکر کشی کے لئے آمادہ ہوئے۔ یہ اتحاد بنیادی طور پر منفی جذبات کی بنیادوں پر قائم ہوا، پھر اتحادیوں کو دنیاوی مال ومتاع کا لالچ دیا گیا۔

ان متحدہ افواج کی تشکیل کی خبر نبی اکرم ﷺ کو ہوئی تو آپ نے اپنے اصحاب کرام سے مشورہ کیا، مشورت اسلام کے اجتماعی اخلاقی نظام میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ مدینۂ منورہ کے شامی رخ پر خندق کھودی جائے۔ جنگ کا یہ طریقہ اہل عرب کے لئے نیا اور اجنبی تھا۔ مدینۂ منورہ میں تین طرف نخلستان اور مکانات تھے جو شہر پناہ کا درجہ رکھتے تھے۔ تین ہزار صحابیوں نے نبی اکرم ﷺ کے زیر قیادت شامی رخ پر خندق کھودنے کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے دس دس آدمیوں کے درمیان دس دس گز زمین تقسیم کی، خندق کی گہرائی پندرہ فٹ رکھی گئی اور چوڑائی میں یہ خیال رکھا گیا کہ گھوڑا چھلانگ کر پار نہ کر سکے۔ صحابہ کرام خندق کھودتے جاتے اور نغمہ الاپتے جاتے۔

نحن الذين بايعوا محمدا

على الاسلام ما يقينا ابدا

ہم وہ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، اسلام پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

خود نبی اکرم ﷺ اس مشقت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ یہ اخلاق کا عظیم رخ ہے کہ مسلمانوں کا قائد، ان کا رسول، دین و دنیا میں ان کا وسیلہ خندق کی کھودائی میں ان کا شریک ہی نہیں بلکہ شریکِ غالب تھا۔ اس کے رخِ انور پر مٹی جم جاتی مگر اس طرح کہ جیسے چاند پر ہلکے سے بادل کا نقاب پڑ جائے۔

وہ مسلمانوں کی اجتماعی عسرت کا زمانہ تھا۔ وہ یہ شدید مشقت کرتے اور اس عالم میں کہ انہیں پیٹ بھر روٹی نہ ملتی۔ صحابہ کرام آخر انسان تھے اور پھر ان کا مشفق سرپرست ان کے ساتھ تھا، ایک دن کچھ صحابہ نے اپنا کپڑا ہٹا کر سرورِ دین ﷺ کو اپنا پیٹ دکھایا جس پر پتھر بندھا ہوا تھا، یہ بھوک پر غالب آنے کی ایک تدبیر تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹا دیا تو جانثار ساتھیوں نے دیکھا کہ شکمِ مبارک پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے، یوں آپ نے قیادت کا اعلیٰ ترین معیار قائم فرمایا۔ محنت بھی دوسروں سے زیادہ اور لینے میں دوسرے سے کم۔ حقوق و فرائض ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ فرض کی ادائی حق حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اللہ کے آخری رسول نے عملی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو یہ سبق دیا ہے کہ ادائے فرض میں دوسرے کے آگے رہو اور حصولِ حق کو دوسروں کو ترجیح دو۔

رسول اللہ ﷺ خندق کھودتے جاتے اور رجز کے کلمات کے ساتھ ساتھ یہ دعائیہ کلمات آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوتے جاتے:

اللھم لا خیر الاّ خیر الآخرۃ

فبارک فی الانصار و المھاجرۃ

اے اللہ! کوئی خیر نہیں، آخرت کے خیر کے علاوہ۔ اے اللہ! انصار و مہاجرین کو برکت عطا فرما۔

یہ خیر خواہی، یہ عمومی طلبِ برکت، راس الاخلاق ہے، اخلاق کا سرمایہ اور اصل۔ حضور ﷺ کی زندگی کا ہر سانس مسلمانوں اور انسانوں کی خیر خواہی سے عبارت تھا اور آپ نے اس بات کو دین قرار دیا۔

الدین نصیحۃ (۶۵)

خندق کی کھدائی کے دوران معتبر روایات کے مطابق دو دو صحابیوں کے درمیان گیارہ گیارہ کھجوریں ''رسد'' کے طور پر تقسیم کی جاتی تھیں۔ دو آدمیوں کے درمیان طاق عدد۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا بلکہ ان میں ایثار کا جذبہ پیدا کرنے کی تدبیر تھی۔ یہ صحابی ایک دوسرے سے کہتے کہ میرے بھائی کو زیادہ خواہش نہیں ہے۔ یہ زائد (گیارہویں) کھجور تم لے لو۔ قرآنِ حکیم نے ایسی ایثار کو مسلمانوں کی شناخت قرار دیا ہے:

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَ لَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَۃٌ (۶۶)

اور وہ (دوسروں کو) اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی شدید ہو۔

یوں نبی اکرم ﷺ نے اقتصادیات اور زندگی کے ہر شعبے کو اخلاقیات کی بنیادوں پر استوار کیا۔

نبی اکرم ﷺ اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے اخلاق کو عقائد اور ایمانیات سے ہم آہنگ فرما دیا۔ غزوہ خندق نے ایک بار پھر اس حقیقت کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا کہ استقامت اور پامردی ایمان کی کسوٹی ہے۔ اُحد کی طرح غزوۂ خندق میں بھی اہلِ ایمان ہلا ہلا دیئے گئے۔ اگرچہ دو بدو جنگ کی نوبت نہیں آئی بلکہ چوبیس ہزار کے لشکر نے مدینے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کی آوازیں، اور اسلحۂ جنگ کی جھنکاریں مدینے کی فضاؤں کو مرتعش کر رہی تھیں اور خندق کے پار سے پتھروں اور تیروں کی بارش جاری تھی۔ ایک جگہ سے جہاں خندق کی چوڑائی کم تھی دو چار سردارانِ کفر کے گھوڑوں نے جست لگا کر خندق کو پار کر لیا، ان میں عمرو بن عبدود بھی تھا، جسے مشرکین ہزار سواروں کے برابر تسلیم کرتے تھے، وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھوں مارا گیا، خندق کے پار سے پتھروں اور تیروں کی مسلسل بارش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ غزوۂ خندق کے دوران ایک دن ایسا بھی آیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کی متصل چار نمازیں قضا ہوئیں کیونکہ تیروں اور پتھروں کی مسلسل بارش میں اپنی جگہ سے ہٹنا اور کہیں جماعت یا نماز قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔

غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے کہ مدینہ منورہ کی آبادی کے تمام گروہ واضح طور پر سامنے آ گئے۔ نفاق کے تمام پردے چاک ہو گئے۔ منافقوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے گھروں کے عدم تحفظ کا عذر تراش کر واپسی کی اجازت چاہی، محاصرے کی شدت اور افواجِ کفر کی تعداد دیکھ کر ان کے دل کی یہ بات زبانوں پر بھی آ گئی کہ معاذ اللہ، اللہ اور رسول نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا اور دوسری طرف اہلِ ایمان کا ایمان آزمائش کی بھٹی میں پگھل کر زرِ خالص بن گیا اور انہوں نے اس گھڑی کو اپنے ایمان کی جانچ کے لئے اللہ تعالیٰ کا انعام قرار دیا، اور آخر کار اللہ کے لشکر، طوفانِ برق و باراں کی شکل میں آ پہنچے۔ کافروں کے خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں، گھوڑوں اور اونٹوں نے اپنی رسیاں تڑا لیں اور ان کی آوازوں سے وہ بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا کہ افواجِ کفر کی ہر تنظیم درہم برہم ہو گئی۔ یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، کھانے کی دیگیں اور برتن، غلے کی بوریاں ادھر ادھر منتشر ہو گئیں اور بیس بائیس دن کے محاصرے کے بعد کفر کے عساکر منتشر گروہوں کی صورت میں واپسی پر یوں مجبور ہوئے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق کبھی نہ تھا۔ (۶۷) یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ مسلمانوں کی فکر،

کردار اور اخلاق کا ایک بنیادی نکتہ یہ حقیقت ہے کہ فتح و نصرت اللہ کی جانب سے ہے، اسی یقین کی بنا پر وہ پامردی اور استقلال کے ساتھ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح میدانِ جنگ میں جم جاتے تھے، سورۂ احزاب، معرکۂ احزاب کی جاودانی تصویر ہے جس کا ہر نقش اور ہر رنگ جاودانی ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا O هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا O وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا O وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَ مَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا O (۶۸)

اور جب (تمہارے دشمن) تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے تم پر چڑھ دوڑے اور جب تمہاری آنکھیں پتھرا گئیں اور تمہارے کلیجے منہ کو آ گئے اور جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں تم طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے اور یوں اہلِ ایمان آزمائے گئے، اور پوری طرح سے ہلا ہلا دیئے گئے تو اس وقت منافق اور وہ جن کے دلوں میں بے یقینی اور نفاق کا روگ تھا کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدے کئے تھے وہ محض دھوکا اور فریب تھے اور انہیں میں سے ایک گروہ نے کہا اے یثرب والو! اب یہاں تمہارا ٹھکانہ نہیں، پس لوٹ چلو۔ اور ان کی ایک جماعت یہ کہہ کر رسول اللہ (ﷺ) سے واپسی کی اجازت مانگنے لگی کہ ہمارے مکان غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ مکان (اور گھر والے) غیر محفوظ نہیں تھے لیکن انہوں نے بھاگنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔

اس قرآنی بیان کو ملاحظہ کیجئے، پوری صورتِ حال کس طرح سامنے آ جاتی ہے، منافقوں اور شک میں مبتلا ہونے کے شک اور نفاق کے درجے اور فرق بھی اس بیانیے میں موجود ہیں، جو پکے منافق تھے انہوں نے اللہ اور رسول کے وعدے کو فریب قرار دیا اور اپنے ساتھیوں کو لوٹ چلنے کا مشورہ دیا اور مدینۃ النبی کو یثرب کہہ کر اپنی اس تمنا کا اظہار کیا کہ تاریخ الٹا سفر شروع کر دے، جن کا نفاق ہلکا تھا وہ رسول اللہ ﷺ سے واپسی کی اجازت طلب کرنے لگے۔

ان منافقوں کے مخالف اہلِ ایمان کے کردار، شخصیت اور اخلاق کی تصویر ملاحظہ ہو:

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ز وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًاO (۲۹)

اور جب اہلِ ایمان نے (کفر کے) لشکروں کو دیکھا تو (پورے یقین کے ساتھ) پکار اٹھے کہ یہ وہی ہیں جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اس (لشکر کشی) نے ان کے ایمان اور فرماں برداری میں اور اضافہ کر دیا۔

یہ غزوہ ذی قعدہ ۵ ہجری میں پیش آیا جو مسلمانوں کی اخلاقی تربیت اور تشکیل کی تاریخ میں ایک موڑ اور سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ العنکبوت:۲۶

۲۔ الصّٰفّٰت:۸۹

۳۔ الصّٰفّٰت:۹۹

۴۔ البقرۃ:۲۱۸

۵۔ النساء:۱۰۰

۶۔ ابن ہشام/ السیرۃ النبویہ/ دار المعارفہ، بیروت، ۱۹۷۸ء: ج۲،ص ۸۷

☆ شامی، محمد بن یوسف/سبل الہدی والرشاد/دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۳ء: ج۲، ص ۳۸۹

۷۔ مریم:۱۶

۸۔ مریم:۲۷تا۳۳

۹۔ ابن ہشام: محولہ بالا۔ سبل الہدی والرشاد: محولہ بالا

۱۰۔ حٰمٓ السجدۃ:۳۰

۱۱۔ ابن ہشام: ج۲،ص۴

☆ ابن سید الناس، عیون الاثر: مکتبہ دار التراث، مدینہ منورہ، ۱۹۹۲ء: ج۱،ص۱۸۹

۱۲۔ ابن ہشام: ج۲،ص۱۰۱

☆ ابن قیم/ زاد المعاد/ مکتبہ المنار الاسلامیہ، کویت، ۱۹۸۷ء: ج۳،ص۳۰

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ الاحقاف:۳۵

۱۵۔ بخاری/ الصحیح / المصطفیٰ البابی الحلبی، مصر، ۱۹۵۳ء: ج۲،ص۲۲۴

☆ شامی: ج۲،ص۳۳۴

۱۶۔ الزخرف:۳۰تا۳۲

۱۷۔ بخاری: ج۲،ص۱۴۶

☆ ابن ہشام: ج۲،ص۱۷۳

۱۸۔ آل عمران:۱۱۰

۱۹۔ آل عمران:۱۱۱

۲۰۔ انفال:۱۷

۲۱۔ بخاری: ج۲،ص۱۴۶
۲۲۔ جن:۱-۲
۲۳۔ ابن حجر العسقلانی/ فتح الباری/ قدیمی کتب خانہ، کراچی: ج۸،ص۸۶۸
۲۴۔ بخاری: ج۲،ص۲۳۱
۲۵۔ سبا:۴۶
۲۶۔ علی متقی الہندی/ کنز العمال: رقم ۱۳۷۲
۲۷۔ فتح الباری: ج۷،ص۲۵۷
۲۸۔ الاسراء:۱
۲۹۔ الاعراف:۱۵۸
۳۰۔ الاعراف:۱۵۷
۳۱۔ ہادیٔ اعظم، سید فضل الرحمٰن، ص۲۴۱، ۲۴۶، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی، جون ۲۰۰۰ء
۳۲۔ حوالہ بالا، ص۲۴۱
۳۳۔ حوالہ بالا، ص۲۴۲
۳۴۔ حوالہ بالا، ص۲۴۲
۳۵۔ حوالہ بالا، ص۲۴۳
۳۶۔ بنی اسرائیل:۸۰
۳۷۔ آل عمران:۳۱
۳۸۔ ہادی اعظم جلد اول، ص۳۱۸
۳۹۔ المائدہ:۲
۴۰۔ الفرقان:۶۳
۴۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ/ الوثائق السیاسیہ/ دار النفائس، بیروت:
۴۲۔ التوبہ:۱۰۸
۴۳۔ آل عمران:۱۱۰
۴۴۔ الکانعام:۱۶۵
۴۵۔ الحجرات:۱۰
۴۶۔ الحجرات:۹
۴۷۔ الحج:۴۸
۴۸۔ الحشر:۹
۴۹۔ الحج:۳۹، ۴۰
۵۰۔ محمد:۴
۵۱۔ الانفال:۶۷، ۶۸
۵۲۔ الانفال:۶۹
۵۳۔ ابن ہشام: ج۳،ص۱۰۸
۵۴۔ ایضاً:ص۱۳۷
۵۵۔ المائدہ:۵۱تا۵۶
۵۶۔ النساء:۳
۵۷۔ النساء:۵۹
۵۸۔ یوسف:۴۰
۵۹۔ النساء:۸
۶۰۔ النساء:۷۹
۶۱۔ النساء: ۸۰
۶۲۔ آل عمران:
۶۳۔ ابن ہشام: ج۳،ص۱۷۱
۶۴۔ آل عمران:۱۴۲، ۱۴۳
۶۵۔ بخاری: ج۲۱،ص۳۰، رقم۵۶
۶۶۔ الحشر:۹
۶۷۔ ابن ہشام: ج۳،ص۳۶۲
۶۸۔ الاحزاب:۱۰تا۱۳
۶۹۔ الاحزاب:۲۲